"نادم سیتاپوری"

مکتبہ سلطانی بمبئی ۳

ناشر:-

سلطان حسین مالکِ مکتبہ سلطانی

ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

باہتمام سلطان حسین مالک سلطانی فائن آرٹ پریس بمبئی شائع کی گئی

۱۵، مارچ ۱۹۴۶ء

(بار اول)

قیمت دو روپے آٹھ آنے

عہ۲

فہرس

"بھیا" اخلاق حسین (بار ایٹ لا لکھنؤ) کے نام

(نادم سیتاپوری)

اونچے ہیں کہ ان تک کبھی کوئی پہونچ ہی نہیں سکتا۔

اور مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھر بھی جھجک نہیں محسوس ہو رہی کہ موجودہ دور سے پہلے کے دور کا ہر ادیب مکمل آرٹسٹ نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جنہوں نے کبھی ماہر فن بننے کی کوشش نہیں کی انہوں نے کبھی اس چیز کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اپنے قلم کو جنبش دینے سے پہلے وہ اس ماحول کو اچھی طرح جانتے اور سمجھنے کی کوشش کریں جسے وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی ایک ایسی بنیادی کمزوری تھی جس سے بڑے سے بڑا ادیب بھی محفوظ نہ رہ سکا یہاں تک کہ نیاز فتحپوری جیسے مشہور و معروف ادیب نے بھی اکثر و بیشتر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نیاز صاحب کو ہمیشہ پارسی حسن ملکوتی نظر آیا۔ ان کے اس بیان کی روشنی میں ہم نے بھی اپنے ذہن میں یہ اچھی طرح جما رکھا تھا پارسی دوشیزہ دنیا بھر کی عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت طرحدار اور نازک ہوتی ہے۔ جو ان ہی کے جواب میں اگر دنیا کی کوئی عورت غرور و فخر کیساتھ پیش کی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہی عورت ہے۔ اگر جب حقیقت بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آئی تو ہمارے یقین کو ایک زبردست ٹھیس لگی۔ اور ہم نے سوچا کہ کاش نیاز صاحب نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا ہوتا اور صرف نیاز فتحپوری صاحب ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہمارے بیشتر پرانے ادیبوں نے چھان بین کی زحمت کبھی گوارہ نہیں فرمائی۔ ان سب کے یہاں مشاہدات سے زیادہ خیالات کو دخل رہا ہے انہوں نے قیاس آرائیوں ہی کو اپنے ادب کی معراج سمجھ رکھا تھا۔

ان کے یہاں الف لیلیٰ کی رنگین داستانیں تھیں۔ بے سر و پا پلاٹ کا الجھاؤ تھا۔ بیشمار کیریکٹر تھے مقفیٰ عبارت آرائی اور لفظوں کے الٹ پھیر میں الجھ الجھ جانا ہی قابل قدر سمجھا جاتا تھا۔ کچھ حضرات عہد قدیم دبدبہ آرائیوں کا ذکر چٹخارے لے لیکر کرتے تھے۔ نثر میں بھی قافیہ

پیمانی کا جنون حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور کچھ اصحاب ONCE APAN A TIME
THER WAS A KING کے قائل تھے۔

لہذا قدرتی طور پر جب نادم سیتاپوری صاحب کی کتاب ۔ منجدھار ۔ پر کچھ لکھنے کا
سوال پیدا ہوا تو معاً میرے دماغ میں بھی تمام خیالات پیدا ہونا شروع ہو گئے اور میں سوچنے لگا
کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میں نے نادم صاحب کو اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ میں ان کے بارے میں
سوا اس کے اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے مخلص دوست ہیں اور ہندوستان کے بہت
پرانے لکھنے والے۔ اور نہ جانے کیوں وہ مجھے بیحد پسند کرتے ہیں۔ اور پھر میں ان کی دوستی
محبت اور خلوص کا دل سے قائل ہوں۔ تو پھر آپ ہی بتائیے کہ میرے لئے کتنا مشکل سوال
تھا، کتنا اہم فریضہ کہ میں ان کی کتاب پر مقدمہ لکھوں۔

آپ یقین فرمائیے کہ ادب کے معاملہ میں جتنا اور جو کچھ بھی میں سمجھتا ہوں میں اسے بلا
جھجھک کہہ دینے کا پرانا مجرم ہوں۔ خواہ مجھے اس جرم کی پاداش میں کتنی ہی بڑی سزا کیوں نہ بھگتنی پڑے۔
میرے وہ احباب اور اعزا جو اکثر و بیشتر ادیب یا شاعر ہیں مجھ سے محض اس لئے بدظن ہو گئے
ہیں محض اس بنا پر مجھ سے قطع تعلق کر چکے ہیں کہ میں نے ان کے ادبی کارناموں پر غلطی سے
اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔

اور پھر میں نے سوچا نادم صاحب بھی تو آخر پرانے ہی لکھنے والوں میں سے ایک
ہیں۔ ان کے یہاں بھی یہی تمام چیزیں ہوں گی اور پھر یہ تمام باتیں سوچ کر میں کانپ گیا تھا
دوستی کا پردہ چاک ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگا اور اس پردے کے پیچھے مجھے دشمنی کا بھیانک
چہرہ نظر آیا۔ میں نے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میں نادم صاحب جیسے

کرم فرماکو اتنی آسانی کیساتھ کھو دینے پر اپنے آپ کو کسی طرح بھی راضی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے مسودات لپیٹ کر میز کی دراز میں رکھ دیئے۔ دو بیت کہ یہ مقدمہ ہرگز ہرگز نہ لکھوں گا۔ خواہ نادم صاحب مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔

۔ آپ کو نادم صاحب کی کتاب پر مقدمہ لکھنا ہی پڑے گا۔ شام کو جب میں گھر آیا تو عذرا بیگم صاحبہ مدیرہ ماہنامہ "حجاب" نے پورے وثوق کیساتھ مجھ سے کہا۔

۔ کیوں ـــــ ؟ میں سمجھا نادم صاحب کا شاید کوئی تازہ حکمنامہ موصول ہوا ہے

۔ کیا انہوں نے پھر کہلا بھیجا ہے۔

۔ انہوں نے نہیں کہلا بھیجا بلکہ ان کے افسانے خود اپنی وکالت کر رہے ہیں۔

۔ کیا مطلب ـــــ ؟

۔ جی ہاں! عذرا بیگم نے فرمایا۔ میں نے آج دن میں انکے تمام مسودات پڑھ لئے ہیں۔

۔ کیسے ہیں افسانے ـــــ

۔ پڑھ لیجئے ـــــ آپ نادم صاحب کے قائل نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ۔ موجودہ دور کے صفحہ اول کے لکھنے والوں سے یقیناً ان کا درجہ کم نہیں ہے۔

۔ اچھا ـــــ! مجھے بڑی خوشی ہوئی اور پھر میں نے وہ تمام مسودات پڑھے۔

نادم صاحب کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے اپنی غلطی کا شدید طور پر احساس ہوا میں نے سوچا کہ اگر میں نے نادم صاحب کو پہلے ہی پڑھا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ کاہے کو آج اتنی الجھن ہوتی۔

نادم صاحب کے تمام تر افسانے جو "منجدھار" میں شامل ہیں حقیقتاً وہ سب کے سب اس قابل ہیں کہ انہیں اردو ادب میں ایک خاص درجہ دیا جاسکے۔ جیسا

کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہمارے ادب نے اب کافی ترقی کر لی ہے۔ اب جو بھی لکھا جاتا ہے بہت سوچ سمجھکر اور کسی خاص مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے محض قیاس آرائیوں اور لفظی گورکھ دھندوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمارا ادب ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ ہمارے ادب کا خاص مقصد ہے۔ اور یہ سب اس لئے کہ ہم نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ادب زندگی کے لئے ہے۔ ہم ادب برائے ادب کے خواب شیریں سے چونک پڑے ہیں۔

اب ہمارا ادیب جو بھی لکھتا ہے بہت سوچ سمجھکر لکھتا ہے کہ اس کا ہر قدم ایک نئی منزل، ایک نئی شاہراہ کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے۔ وہ جو بھی لکھتا ہے یہ سمجھکر لکھتا ہے کہ اس کے مضامین ملک و قوم کی کسی نہ کسی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں ضرور معاون ثابت ہوں گے وہ اس نظریہ کے تحت قلم اٹھاتا ہے کہ اسے اپنے قلم سے بہت کچھ کام لینا ہے۔ کچلی ہوئی ذہنیتوں بجھی بجھی زندگیوں اور سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرنا، انہیں ان کے صحیح مقصد کی طرف رجوع کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ آج کل الف لیلی کی رنگین داستانوں اور حسن و عشق کی دلگداز کہانیوں کی ضرورت نہیں —— ملک کی بے چینی اور اس کی بیماری کا علاج میٹھی میٹھی لوریوں میں نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایسی کڑوی گولیوں کی ضرورت ہے ایسے ایسے تیز نشتروں کی ضرورت ہے جو اس کے زخموں کو کرید کرید کر صاف کر دیں، سڑے، بدبودار اور گھناؤنے پھوڑے کو ختم کر دیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاکہ پھوڑا بڑھتے بڑھتے ناسور نہ بن جائے کہیں پورا جسم سڑ سڑ کر نہ گلنے لگے۔

اور اب ہم ہنس بھی تو کافی چکے ہیں۔ اور اسی ہنسی ہنسی ہی میں تو ہم نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ ہم مفلس ہو چکے ہیں، مذاق مذاق میں محض تفریحات ہی کی خاطر تو ہم نے

اپنے لئے ذلتیں اور رسوائیاں خریدی ہیں اور اسی لئے ہمیں اب ایسے ادب کی ضرورت نہیں ہے
جو ہمیں محض ہنساتا رہے۔ ہم دنیا و مافیہا سے بےخبر اپنا پیٹ پکڑے ہنستے رہیں۔ اور ہمارے
آج کل کے ادیب اس راز کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں لہذا ان کے مزاح میں بھی کوئی نہ کوئی پیغام
ضرور ہوتا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں بڑے بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اب ان کے مزاح پر طنز
غالب آچکا ہے۔ ایسا طنز جو ہمارے لئے غافل ہونے پر بھی ہمیں جھنجھوڑ دے، ہمیں مجبور کر دے
کہ ہم کچھ سوچیں سمجھیں اور پھر اسی سوچ و سمجھ کی روشنی میں ہم اپنے لئے کوئی راستہ تلاش کریں ایسا راستہ
جس کے ذریعہ ہمیں اپنے منزل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اور ہم جلد سے جلد
اپنے مقصد کو پالیں۔

زمانہ بہت کافی بدل چکا ہے اور ہمارا ادب اور ہمارے ادیب بھی جیسا کہ میں پہلے
کہہ چکا ہوں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ لہذا لازمی طور پر وہ اپنا وقت اب فضول ضائع نہیں کرتے
بساطِ ادب پر بڑے بڑے ماہر فن جمع ہیں اور وہ اپنی جدوجہد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی
پوری پوری کوشش کر رہے ہیں آج کل اپنی منفردیت قائم رکھنا ہر ادیب کے لئے ایک اہم
مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اپنی شہرت، وہ اپنے وقار قائم رکھنے کیلئے انہیں پیہم جدوجہد کرنی پڑتی ہے
اگر بڑے سے بڑا ادیب بھی تادیر خاموش رہے تو لوگ اسے بھلا دیتے ہیں۔ وہ حرفِ غلط کی طرح
لوگوں کے ذہنوں سے مٹ جاتا ہے، آج کل کوئی ادیب نیا یا پرانا اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا
کہ وہ ایک پہاڑ ہے۔ اور اس سے ٹکرانا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔

اور میں نے اسی نظریہ کی روشنی میں جب نادم صاحب سیتاپوری کے تمام افسانے
پڑھے تو وہ مجھے ہر طرح جامع اور مکمل معلوم ہوئے۔ سنجیدہ ادب میں نادم صاحب مختلف
شکلوں میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ کہیں وہ سنجیدہ ہیں۔ انتہائی سنجیدگی کیساتھ انہوں نے

نازک سے نازک مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اور کہیں پردہ کہیں ہشیار سے ہیں۔ مگر اس انداز میں کہ ان کی مزاح نگاری پھکڑ بازی کی زد میں شمار نہ ہونے لگے۔ کہیں پردہ ایک ماہر فن فنکار کی طرح جنسیاتی مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔ ایک بازاری طوائف انتہائی گھٹیا قسم کی جو صرف چند ٹکوں میں جنسی بھوک کو دور کر سکتی ہے۔ اسکے کیرکٹر اور اس کے ماحول کو نادم صاحب نے جس خوبصورتی کیساتھ ہمارے سامنے رکھا ہے وہ یقیناً حقیقت نگاری کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور یہیں پر ہمیں نادم صاحب کے آرٹ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ نادم صاحب دور حاضرہ کے ترقی پسند ادیبوں سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہیں وہ اس دور میں سب کے ساتھ ہیں۔

آپ مجموعہ کا ہر افسانہ پڑھیے۔ اور پھر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ نادم صاحب ایک فنکار کی صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں کہ نہیں۔

آنچ۔ بھلے آدمی۔ ٹکا ہیاں۔ ہچکولے۔ جب جوانی آ رہی تھی۔ ماموں جان۔ اللہ کی دین۔ جہاں بات بنائے نہ بنے۔

اور اسی قسم کے دوسرے افسانے نادم صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نادم صاحب کا مشاہدہ کتنا وسیع اور نگاہیں کتنی دور رس ہیں وہ ماحول میں کس طرح جذب ہو جاتے ہیں۔

مجموعہ کے تمام تر افسانے ایسے ہیں جن میں زندگیاں چلتی پھرتی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ افسانہ کا ہر کردار ہمیں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور افسانہ نگار کا یہ ایک ایسا کمال ہے جس کی موجودگی اسے ایک مکمل فنکار، آرٹسٹ کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور ہم آرٹسٹ کے آرٹ کو دل سے چاہنے لگتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ گمنام صاحب کے یہ افسانے ملک کے طول و عرض میں بیحد پسند کئے جائیں گے۔ اور ان کی کتاب "منجدھار" اردو ادب کی عمدہ کتابوں میں ایک قیمتی اضافہ ثابت ہوگی۔

عادل رشید

کیڈل روڈ، ماہم بمبئی ۱۶، ۷؍ مارچ ۱۹۴۶ء

سارا دن بہی کھاتہ کی چھان بین کرتے ـــ دو کوڑوں کی میزانیں جوڑتے جوڑتے جب شام کو دس بجے گھر میں آتے تو ریڈیو پر کھلتے اور چڑھتے بھاؤ سنتے ہی سنتے ان کی آنکھوں میں تھکاوٹ ـــ جوڑ جوڑ میں درد ـــ اور سارے بدن میں الکساہٹ کا سمندر موجیں مارنے لگتا۔ حقے کے دو چار لمبے لمبے کش کھینچ کر وہ خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے۔ تو یہ ریڈیو والے یا تو نئے طرز کی غزلیں شروع کر دیتے یا ٹھمریاں ـ کبھی کبھی دیہاتی پروگرام شروع ہو جاتا ـــ پاٹ دار آوازیں۔ ڈرامے کے مکالمے کان کے پردے پھاڑنے لگتے ـــ! انگریزی میں تقریر ہونے لگتی۔ ان کے تھکے ہارے دماغ میں یہ نرم۔ غیر شاعرانہ۔ چیزیں اس طرح ٹکرا جاتیں جیسے۔ شے لطیف۔ سے معمور دلوں میں سونے چاندی کے بھاؤ! ان کے تخیلات کی وسعتیں زیادہ سے زیادہ خبریں سن سکتی تھیں جن کو۔ بدرستی حواس خمسہ، اکثر وہ سن اور سمجھ کر اپنے منیم اور دوسرے سیاستدانوں سے تجزیہ بیان کیا کرتے گویا کہ سیاست میں وہ مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کے ہم پلہ ہیں۔

ریڈیو بند کر کے وہ کرسی پر لیٹے لیٹے پاؤں پھیلا دیتے ـــ!

اری جمنا ـــ! کہاں مر گئی۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔

جمنا — جی آئی لالہ جی۔ کہتی ہوئی آجاتی اور چپ چاپ بیٹھ کر پاؤں کی انگلیاں اور انگوٹھے مروڑنے لگتی! دوبے جی آنکھیں بند کئے ہوئے منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیوں پر جمائیاں لیتے جمنا کے گورے گورے ہاتھ لالہ جی کی پنڈلیاں دباتے رہتے، جن پر اُگے ہوئے بالوں کے گچھوں کو بچانے کیلئے وہ اپنے ہاتھوں کی گرفت ملائم اور ڈھیلی رکھتی — اتنی دیر میں نہ جانے لالہ جی کتنی ہی دودو منٹ کی نیندیں لے ڈالتے! جمنا کے ہاتھ اپنا وقت پورا کرکے تلوؤں کو سہلانے لگتے اور تلملا کر انگڑائیاں لیکر جاگ جاتے ان کو پاؤں خود بخود سمٹ کر نیچے ہو جاتے —!!

جمنا چپ چاپ چلی جاتی —

لالہ جی اٹھکر سوئیں جاتے — بھابی — اُبلا ہوا ساگ — کھٹائی اور تلی پوریاں، ہضم کرنے کے لئے چند جگر خراش ڈکاریں اس طرح لیتے جیسے۔ جاپانی مارکین۔ پھاڑی جاتی ہے۔ ۔ دم نارائن۔ کہتے ہوئے پلنگ پر لیٹتے ہی ان کو تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ نیند پوری کر لینے کے بعد صبح ہونے سے پہلے ہی ان کے بے ہنگم خراٹے ان کو جگا دیتے،

بیس پچیس سال سے ان کی زندگی کی روزمرہ یہی رفتار تھی —!

جمنا — ایک نخی کلی تھی بیچاری۔ گرمی اور برسات کی پندرہ سولہ بہاریں اس نے اسی۔ دیالو بھون۔ کی چھایا میں بتائی تھیں۔ وہ کتنی چھوٹی تھی جب دوبے جی نے اسے پال لیا تھا —! یہ خود اسے یاد نہ تھا۔

ماں کا نام تو اس نے ضرور سنا تھا لیکن اس نے اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی جس پر ماں ہونیکا شبہ کر سکتی! دوبے جی کا اندھیرا گھر اس کے آنے سے پہلے ہی ایسا تھا۔ وہ ایک بڑے کاروباری آدمی تھے۔ اپنی ذاتی ذات کے لحاظ سے تو ان کو ایک۔ ودیانت۔ ہونا

چاہیے تھا لیکن ان کی سفید سفید مونچھیں جن کو حقے کے نیلگوں دھوئیں نے بھورا کر دیا۔ کچھ کم ساٹھ سال سے اسی ماحول میں بڑھتی رہی تھیں۔ جن سے ذہنیت کاروباری اور دماغ سرمایہ پرست ہو چکا تھا۔

اُن کی بیشمار پونجی جس پر ہر سال دیوالی کے دیئے جگائے جاتے تھے، بنکوں میں بہت کم تھی۔ زیادہ تر اُن کے دفینے اسی گھر میں گڑے ہوئے تھے جس میں ان کا ایک نوکر اور [illegible] کے پالک۔ جمنا رہتی تھی۔ بوڑھا نوکر لالہ جی کی سیوا کرتے کرتے جمنا کی طرح اُن کے کنبہ کا ایک رُکن بن گیا تھا جس پر انہیں اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا اعتبار وہ خود اپنے آپ پر کر سکتے تھے۔ وہ بے جی کی، محرم تھی۔ صرف ایک بچہ کی ماں ہونے کے بعد ہی اس دنیا سے چل بسی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ ہی اس کمسن بچہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا جس میں شاید یتیم رہ کر جینے کی سکت باقی نہ تھی ——!

بیس پچیس سال ادھر کی یہ بات تھی ——! اس کے بعد بھول کر بھی دو بے جی نے کبھی اپنا گھر بسانے کا خیال نہیں کیا۔ شاید ان کا دل گرہستی کے جنجال سے گھبرا گیا تھا ——! وہ سوچتے تھے کہ اگر بھگوان مجھے آباد ہی رکھنا چاہتے تھے تو اجاڑتے کاہے کو۔ اب ان کے دل میں سوائے روپیہ جوڑنے کے اور کوئی بھی ہوس نہ تھی۔ ان بیس پچیس برس کے اندر اس کے دل میں کوئی بھی ایسا جذبہ نہ جاگ سکا جو ان کے جیون میں آشاؤں کا ایک دیا بھی جلا سکتا وہ ایک برف کی منجمد چٹان کی طرح حس و حرکت بنی کاروباری دنیا میں مصروف رہتے —— ان کے حسیات میں اتنے دنوں سے کوئی بھی انقلاب نہ آ سکا۔ کولہو کے بیل کی طرح دم بھر کام میں لگے رہنا، کھانا پینا، ریڈیو سننا، اور سو جانا —— اس سے زیادہ ان کی زندگی کا کوئی پروگرام نہ تھا ——!!

جمنا کی [illegible] ہوتی ہوئی بھی ان کو چونکا نہ سکی۔ گویا ایک [illegible] جس

میں موجوں کی روانی مدھم سروں میں گا رہی ہو ــــ اُن کے سپنوں کا سنسار ۔ کتنا خاموش جیون تھا جس میں کبھی بھی کوئی رنگین خواب نظر نہ آسکا ۔ بڑھاپا ۔ سو بیماریوں کی ایک بڑی ہوتی ہے ۔ فصل کی معمولی تبدیلی سے کمزور جسم کو نت نئے روگ لگ جاتے ہیں ۔ دو بے جی بھی ایک صبح جب سو کر اُٹھے تو سر میں میٹھا میٹھا درد اور خفیف سی حرارت تھی ! بستر پر پڑے پڑے جمنا کو آواز دی ـــ !

" جا کر دکان پر فون کر دے ! آج میرا جی اچھا نہیں ہے شاید نہ آسکوں اور

" جی اچھا " کہتی ہوئی جمنا فون " کرنے چلی گئی ۔

تھوڑی دیر بعد واپس آگئی ـــــ

" کیسی طبیعت ہے لالہ جی "

" اچھا ہوں کچھ سر میں درد ہے " لالہ جی تکیے پر ماتھے کو ٹیکتے ہوئے بولے !

" لاؤ میں سر دبا دوں " جمنا نے کہا !

" نہیں کیا کرو گی " آنکھیں بند کئے ہوئے لالہ جی نے جواب دیا !

" نہیں ـــ لاؤ میں سر دبا دونگی تکلیف نہ ہوگی " جمنا بولی ۔

لالہ جی بدستور کروٹ لئے ہوئے لیٹے رہے ۔ جمنا آہستہ سے پلنگ پر بیٹھ کر سر دبانے لگی ! ان کی آنکھیں بیجان مجسمہ کی طرح بند تھیں ! جمنا کے گورے گورے ہاتھ انکے ماتھے کی سلوٹوں اور سر کے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں پر اس طرح تیر رہے تھے ۔ جیسے کسی نہر میں بطوں کا جوڑا رقص کر رہا ہو ! اُن کی آنکھوں میں غرض اور انہماک کیساتھ سُرخ سُرخ ڈورے چمک رہے تھے جن کی مقناطیسی کشش پتھر کی چٹانوں میں جنبش پیدا کر سکتی تھی ! لالہ جی کی پیٹھ سے لگی ہوئی اس کی دھانی ساری سے اس کا بلوریں جسم سنگِ مرمر کی طرح جھلک

رہا تھا۔ اور جڑی ہوئی رانوں سے چقماق کے ٹکراتے ہوئے پتھروں جیسی آنچ نکل رہی تھی؛
لالہ جی کو خود حرارت تھی۔ لیکن کئی بار اسکے گرم گرم دہکتے ہوئے ہاتھوں کی حدت سے وہ چونک
پڑے! پسینے کے چند قطرے جمنا کے ماتھے پر شبنم کی بوندوں کی طرح چمکنے کے لئے بیقرار
ہو رہے تھے! جن کو کئی مرتبہ اس نے اپنی باہنوں سے پونچھ ڈالا تھا۔ مگر بد باران کی بیقراریاں
روکے نہ رک سکیں! اور چند قطرے لالہ جی کے جھریوں والے چہرے پر ٹپک ہی پڑے انہوں نے
آنکھیں کھول دیں۔

"رو رہی ہے ۔۔۔ جمنا۔"

"نہیں تو لالہ جی ۔۔۔ شاید پسینہ ٹپک گیا ہوگا۔" اس نے پیشانی پونچھتے ہوئے
جواب دیا۔

آج زندگی میں پہلی بار ان کی آنکھیں جمنا کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ وہ بولے!

"رہنے دو ۔۔۔ شاید تم تھک گئیں!"

"نہیں میں تھکی نہیں ۔۔۔ لالہ جی"

لالہ جی نے کروٹ بدلی! جمنا دوسری طرف بیٹھ کر پھر سر دبانے لگی!
ان کے ساکن جسم سے ایک بار جمنا کا تپتا ہوا جسم مس ہو گیا! منجمد خون کی روانی میں
ایک تڑپ سی پیدا ہو گئی۔ برف کی چٹان سورج کی برق پاش کرنوں سے جنبش میں آ گئی۔
لالہ جی نے آج بیس سال کے بعد جوانی کی ہلکی ہلکی آنچ کو اپنی رگ رگ میں سرایت ہوتے
ہوئے محسوس کیا! ان کے نڈھال بڑھاپے میں نوجوانی کا سمندر لہریں لینے لگا۔ آنکھیں کچھ دیر کے
لئے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور دل کی حرکت لمحہ بھر کو رک گئی! ان کا جسم بے قابو ہونے کے لئے
بیتاب ہو رہا تھا۔ وہ سچ مچ اس یکایک تبدیلی سے گھبرا گئے۔

"پانی"

جمنا اٹھکر پانی لینے کو چلی گئی۔ ان کے خیالات میں عجب ہیجانی کیفیت پیدا ہو رہی تھی!

دو گھونٹ پانی پی کر وہ اٹھ بیٹھے اور جمنا کو سر دبانے سے منع کر دیا۔

دو تین روز میں لالہ جی کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ لیکن ایک نئی خلش کانٹے کی طرح ان کے دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس زندگی کے خاموش خواب آج پچیس سال سے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ساکن اور بےحس ہیں! ان میں دفعتاً ایسی خوفناک..... ......اور تباہ کن ...... تبدیلی! ان کا سارا بدن کانپ اٹھتا جب وہ سوچتے کہ جمنا کو انہوں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے ...... پھر ...... پھر بھی کیا ہوا .... مرد مرد ہی ہے ....!

ایک ہلکی ہلکی آنچ نے جس دوشیزگی کی مقناطیسی کشش ان کے جسم بھر میں کھپا دی تھی۔ ایک کانٹے کے مانند کھٹک رہی تھی۔ اپنی جوانی کے کتنے پریشان خواب اُن کو رہ رہ کر چونکا رہے تھے .... اب سے بہت دن پہلے کی زندگی یاد آ رہی تھی ——!
بیماری سے اٹھنے کے بعد لالہ جی نے کتنی راتیں اسی سوچ وچار میں گذاری تھیں!

جمنا اب بھی ہاتھ پاؤں دبا کر تلوے سہلاتے سہلاتے چلی جایا کرتی۔ ایک دن ان کی طبیعت کچھ زیادہ کسل مند تھی۔ دوکان سے آکر ریڈیو بھی نہیں سنا۔ رسوئی میں بھی نہیں گئے! چپ چاپ منہ لپیٹ کر پڑ رہے! مسکراتی ہوئی جمنا آئی!

- کھانا کھاؤ لالہ جی۔

میں آج کچھ نہ کھاؤں گا جمنا۔ میرے بدن میں درد ہو رہا ہے۔ لالہ جی نے ایک انگڑائی لیکر آنکھیں کھول دیں۔

"تو میں بدن دبائے دیتی ہوں"

انہوں نے کروٹ لے لی۔ جمنا پاس بیٹھ کر آہستہ آہستہ پاؤں دابنے لگی۔ اس کی کالی ساری کا پلو کئی مرتبہ جسم کی جنبش سے سرک کر شانوں پر آگیا۔ اسکے ملائم ہاتھ سارا بوجھ ان کی پنڈلیوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ اور اس کا آدھا جسم لالہ جی کے جسم سے ٹکرا رہا تھا۔ اسکے جسم سے ویسی ہی آنچ نکل رہی تھی۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو لالہ جی کی دماغ کی گہرائیوں میں گھر کر چکی تھی انہوں نے یکایک آنکھیں کھول کر کروٹ لے لی۔ جمنا اس طرف سے اٹھ کر پھر دوسری طرف بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ بدستور پنڈلیوں سے گذر کر ان کی کمر تک دوڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی پیٹھ اور شانوں تک پہونچ جاتے لالہ جی کی آنکھوں میں نیند کا نام تک نہ تھا۔ ان کے بے ہنگم خراٹے ضرور سو رہے تھے۔ بدن کا رواں رواں چونکا جا رہا تھا۔ بار بار آنکھیں بند ہوکر خود بخود کھل جاتیں۔ جمنا کی نگاہیں زیادہ تر شانوں پر سرک جانیوالی ساری کی نگہبانی میں مصروف تھیں۔ جسے ہر بار وہ درست کرتی رہتی۔

جب لوہے کو نرم نرم آنچ پر تپایا جاتا ہے تو اس کی رنگت سرخ انگاروں کی مانند میں بدل جایا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کا وہ بدنما ٹکڑا ایک خوبصورت لال کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ جس کی سختی اور ناہمواری کو آنکھوں کی باذبیت قبول نہیں کرتی۔ بالکل یہی حالت لالہ جی کی ہو رہی تھی۔ ان کے جسم پر پڑی ہوئی بڑھاپے کی جھریوں میں آج بلا کا تناؤ تھا۔ چہرے پر لٹکی ہوئی کھال دلی کیفیات کیساتھ موجوں کی طرح سمٹ کر جانے کس آنے والے طوفان کیلئے راستہ چھوڑ گئی تھی۔ چہرہ خون کی روانی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

مست شرابی کی طرح مخمور آنکھیں کوندر جمنا کی معصوم نگاہوں سے الجھ گئیں۔ دو کروڑوں میں ، زلزلہ آ گیا۔ دونوں ہاتھوں نے ۔ دھنش ۔ کی طرح کج ہو کر بلند ہوتے ہوئے جمنا کے ماہتاب جیسے چمکتے ہوئے چہرے اور ساون کی گھٹاؤں کی طرح بکھرے ہوئے بالوں کا حلقہ بنالیا۔

پاس ہی گلی سے اونچے سُروں میں گانے کی آواز آ رہی تھی۔
کیسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ ۔

"یہ بھابیاں"

کسی بُری نیت سے نہیں! دراصل بھابی کی عادت ہی تھی کہ ان کے پیٹ میں پانی پچتا ہی نہیں تھا۔ ذرا کسی نے کوئی بات کہی اور وہ بیچاری پیٹ پکڑے ہوئے دوڑیں گلنار۔ بوا نصیبن۔ بی منلانی حتیٰ کہ رکمنی مہترانی کا بھی ہاتھ پکڑ کر کہہ دیتیں: "بہن آج خلیل بیوی یہ کہہ رہی تھیں ے بھلا تم ہی بتاؤ میری جوتی کو کیا پڑی جو سب سے کہتی پھروں کہ یہ ہوا...... مجھ سے کہتی تھیں کسی سے کہئے گا نہیں" یہ بالکل واقعہ ہے کہ صحیح اور سچے واقعات کو بلا کم و کاست۔ سنسنی خیز۔ بنا دینے کے معاملہ میں وہ رائٹر (Reuter) فری پریس۔ اور بھائی امین سلونوی کی انڈیپنڈنٹ نیوز سروس کو بھی مات کئے ہوئے تھیں۔ دو کالمی اور چو کالمی خبروں کا تو ذکر ہی کیا اکثر ان کی بیان کی ہوئی خبریں معمولی اور روزمرہ کے واقعات کو بات کا بتنگڑ بنا دیتیں۔ ہوتا یہ تھا کہ اکثر صبح کی چاء پر اخبار آنے سے پہلے ہی وہ ایسی خبریں براڈکاسٹ کر دیتیں کہ ایک ایک واقعہ پر سارا سارا دن ہو ہو کئے جاتے۔ اور معاملہ کی اہمیت میں کمی نہ ہوتی اسی لئے میں نے ان کا نام رکھ دیا تھا "بے چھپا اخبار"۔ اُس دن بھی بات تو کوئی نہ تھی صرف اتنا واقعہ تھا کہ اسلم کو کچھ حرارت سی معلوم ہو رہی تھی۔ میں ٹمپریچر لے رہا تھا۔ خدا جانے بھابی کو کس نامراد نے کیا خبر پہنچائی کہ فوراً دوڑی ہوئی پہنچیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے تھرمامیٹر چھپاتے ہوئے جواب دیا "جی کچھ نہیں! آپ کو کیا؟"
بھابی کے ذوقِ اشتیاق میں ہلچل مچ گئی۔

"نہیں کچھ تو ضرور ہے تم کو بتانا ہوگا۔"

"تو آپ بلا پوچھے ہوئے نہیں مانیں گی؟"

"جی ...... جلدی بتائیے کیا بات؟"

میں نے ان کے کان کے قریب جا کر کہا بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے!

"یہ جو ہیں .... کیا نام کہ بس سمجھ جائیے ان کے ہاں"

"ارے بھی کچھ کہو گے بھی .... کیا ہوا ان کے یہاں ......" بھابی نے زور سے رازداری کی داد دی۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں آپ سنتی بھی ہیں؟ بس سمجھ جائیے کہ ان کے یہاں خوشی ہونیوالی ہے"

"جھوٹ بالکل جھوٹ! دلھن کیا یہ سچ ہے؟" بھابی نے بیگم کو بھی مخاطب بنالیا۔ وہ جھینپ گئیں۔

"خیر جانے دیجئے! اسی لئے تو کوئی بات آپ کو بتاتا نہیں ہوں۔ یہ جو آلہ لایا ہوں انگریزی۔ یہ بھی جھوٹا ہے؟" میں نے جیب کے ایک کونہ سے تھرمامیٹر کا سر نکالتے ہوئے کہا۔

"کیسا آلہ؟ لاؤ دیکھوں تو!" بھابی کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"جی دیکھنے کی نہیں ہوتی ...... پھر یہ تو جھوٹا ہے"

"میں کہتی ہوں اس ہولے آلے میں کیا ہے دیکھوں تو "

"میں بھی کہتا ہوں کہ یہ عورتیں نہیں دیکھتیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انڈے میں مرغی ہے یا مرغا۔"

بھابی جھینپ گئیں۔ بیگم مسکرا کر غسلخانہ میں بڑھیں۔ لیکن بھابی کو کہاں چین تھا میرے قریب سرک کر رازدارانہ انداز میں پھر پوچھنے لگیں " تمہیں میری جان کی قسم سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے ؟"

" بات تو کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ اب کے یہاں لڑکی پیدا ہونیوالی ہے "

" تو اس آلے سے تم یہی دیکھ رہے تھے۔ میں اب سمجھی "

جس طرح اخبار کے نمائندے کسی لیڈر کے منہ کی بھاپ پاکر اپنے دفتروں کی طرف خوش خوش بھاگتے ہیں بالکل اسی طرح بھابی نے ۔ میرے بیان کو سن کر " عوام النّاس " کی طرف رُخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے گھر میں بھابی نے یہ خبر براڈ کاسٹ کر دی۔ اب کیا تھا جسے دیکھو " بیگم " کی طرف عجیب طنزانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ بیگم تھیں کہ قدم قدم پر کٹی جا رہی تھیں۔ ہزار ہا قسمیں کھا کھا کر بھابی کو اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن بھابی کہاں اس " شاعرانہ انکسار " میں آنیوالی " لو بیوی! یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے۔ اللہ کل کے لاتے آج ہی وہ دن دکھائے تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو..... نا..... نا ایسی باتوں میں مذاق اچھا نہیں ہوتا "

مختصر یہ کہ بیگم کی تمام " صفائی " بیکار ہو گئی۔ بھابی نے امی جان کو یقین دلا دیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ نور امیڈ وائیف بلائی گئی۔ لیکن شائد کمبخت کو بھابی سے عداوت تھی۔ فیصلہ بھابی کے خلاف ہوا۔ یعنی " کوئی بات نہ تھی "۔ بیگم اس مذاق سے بڑے

آٹھ دن تک مجھ سے منہ چھپائے رہیں ۔

آئے دن ایسا ہی ہوتا رہتا ۔ سارے گھر کا ناطقہ بند تھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی جو کچھ بولتا ۔ کیونکہ بھابی کی یہ صحافتی خدمات بھائی اور خلوص میں ڈوبی ہوئی تھیں ۔ دوسرے ان میں استادشہ سے پرخاش کا خیال بالکل نہیں ہوتا تھا ؟ دوسرے یہ کہ ۔ پھر شاعری ذریعہ عزت وقتی انھیں ۔ مطلب یہ کہ ان کا ۔ براڈکاسٹنگ اسٹیشن کسی بیوپار ۔ مصلحت نہیں تھا ۔ بلکہ خالصتاً لوجہ اللہ ۔ یہی وجہ تھی کہ کیمپ نگ کو ان کی ۔ گزارش احوال واقعی ، اکثر ملتوی کرنا پڑتی ۔ جب کبھی مقطع میں کوئی سخن گسترانہ بات آجاتی ۔

ہاں تو ایک روز ہوا یہ کہ میں اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا ہوا ۱۱ بجے کچھ پرانے خطوط اور البم کی تلاشی لے رہا تھا کہ ناگاہ ، یا قضائے کار خود ادرحوش بھابی مع اپنی تمام طمطراق کے ۔ میں جب محویت کے عالم میں تصویروں کے البم سے کھیل رہا تھا ۔ کالج لائف کی رنگین اور کبھی نہ بھولنے والی زندگی کے نصیب خواب آہستہ آہستہ فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے ۔

دفعتاً کرسی کے پیچھے سے بھابی نے ہاتھ بڑھا کر تصویروں کا البم جھپٹ لیا میرے چہرہ کو دیکھا اور پھر پیش نظر تصویر کو ۔

"یہ تصویر کس کی ہے ؟"

میں نے بلا تامل عرض کیا ۔

"میری جان و دل کی ملکہ کی"

"یعنی ہم ؟" بھابی نے یا اونی کو لگ کرتے ہوئے پوچھا ۔

"یعنی یہی کہ جن کو آپ دیکھ رہی ہیں۔"

"ہاں تو یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ یہ ہے کون۔؟"

"بس یہی۔ کیا نام؟ کہ سمجھ لیجئے 'میری محبوبہ.....' !"

"اچھا تو یہ باتیں ہیں جناب کی۔" بھابی نے کولمبس کی طرح امریکہ دریافت کر لینے کے انداز میں کہا۔!

"جی ہاں! دل ہی تو ہے۔" میں نے مصرع پہ مصرع لگا دیا۔

"بہت خوب۔ اچھے آپ اور اچھا آپ کا دل۔ آخر یہ ہے کون۔؟"

"لیکن یہ پوچھنے کا آپ کو حق نہیں۔"

"مگر بتانا تو پڑیگا تم کو۔" بھابی نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں تو بتا بھی دوں گا۔"

"نہیں ابھی۔"

"اچھا سنئے۔ لیکن ایک شرط ہے کسی تیسرے آدمی کو یہ باتیں نہ معلوم ہوں۔" میں نے رازداری کا وعدہ لیتے ہوئے کہا۔!

"میری پیاری صفیہ کی۔"

اتنا سننا تھا کہ بھابی سر ہو گئیں، ولدیت، قومیت، سکونت غرضکہ سب کچھ تو پوچھ ڈالا۔ میں بھی کہنے پر تلا بیٹھا تھا۔ عرض کرنا شروع کر دیا۔ پچھلے دنوں جب میں دہلی گیا تھا تو صفیہ سے ملاقات ہوئی ریل میں۔ وہ بھی کیسے کہ میں نگاہوں کے راستے دل کھو چکا تھا۔ ان کے حسن و جمال نے مجھے اپنا لیا۔ علیگڑھ میں پڑھتی ہیں۔ بہت شریف ہیں۔ آہ۔! گویا میں کسی ڈرامے کے ڈائیلاگ بول رہا تھا۔ لیکن۔ لیکن بھابی خدا کے

اب جو آگے قدم اٹھاتا ہوں تو امی جان نظر آئیں چھالیہ کتر رہی تھیں۔ سروتہ ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا وہ دُہائی مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ بھابی تو اسی تاک ہی میں تھیں فوراً جائے واردات پر پہونچ گئیں۔ اور ناصح مشفق بن کر اچھی طرح امی جان کے غصہ کو مشتعل کر دیا۔ چارہ ہی کیا تھا سر نکالے ہوئے میں باہر چلا گیا۔

چند دوستوں کے ساتھ آج کھانے اور پکچر کا پروگرام تھا۔ پکچر سے واپسی پر صاحب خانہ سے کھانے کی معذرت کر کے جو گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں بیگم کے کمرے میں فل بنچ جمع ہے، امی جان، بھابی، بیگم، اور بھائی صاحب! جان ہی تو نکل گئی۔ واقعی معاملہ خطرناک سے خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ یعنی ان واقعات کی پوری اطلاع بھائی صاحب کو ہو چکی تھی۔ اور بیچاری بیگم کا گریہ بھی ان کو دکھایا جا چکا تھا۔ سارے گھر میں تلاطم بپا تھا۔ بھابی نے اچھا خاصہ بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔ اور نہایت انہماک و خلوص کے ساتھ سنی بیخ زماری تھیں کہ میں ڈلنڈتا جاؤں انہوں نے گھر بھر کو یقین دلا دیا تھا کہ میں صفیہ کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اگر فوری کارروائی نہ کی گئی تو معاملہ تیر از کمان رفتہ ہو جائے گا۔ د۔ میں یا تو صفیہ سے نکاح کر لوں گا۔ یا پاگل ہو جاؤں گا۔ شادی کر لینے کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اس اللہ بندی کو یقیناً زندہ در گور ہونا پڑے گا۔ جس کو کچھ کم سوا لاکھ سکۂ رائج الوقت کے بدلے میں میں نے اپنے نکاح میں قبول کیا ہے۔ کپڑے بدل کر جب میں عدالت عالیہ کے سامنے پیش ہوا تو بھائی صاحب نے۔ وہ تصویر میرے سامنے رکھ دی۔

"یہ کس کی تصویر ہے۔"

اب واقعی معاملہ زیادہ اُلجھ گیا تھا۔ بات بگڑ جانے کا اندیشہ تھا میں نے عرض کیا۔

بھابی ہی سے پوچھ لیجئے۔

بیچاری بھابی تو ایسے فی سبیل اللہ کاموں کی منتظر ہی رہتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے پوری داستانِ محبت دہرا دی۔ اور ساتھ ہی ساتھ عورتوں کے "بین الاقوامی حقوق" کی جو ذمہ داری ان پر عاید ہوتی تھی۔ اس کی بھی ترجمانی کرتے ہوئے بیگم کا دکھ درد بھی بیان کر دیا

ابھی "الف لیلہ" کا آخری باب بھی ختم نہ ہوا تھا کہ ہر چہار طرف سے بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

سب سے پہلے تو امی جان نے اپنا بھاشن "خطبۂ صدارت" ختم فرمایا۔ پھر بھائی صاحب نے مولوی نذیر احمد صاحب کی "الحقوق والفرائض" سنائی۔

میں تھا کہ ساکت و صامت کھڑا ہوا سب کچھ سن رہا تھا۔ بھابی اس طرح خاموش کھڑی تھیں جیسے ان واقعات سے ان کو کچھ واسطہ ہی نہیں۔

"ملزم" کے بیان کی باری تھی۔ بھائی صاحب مجھ سے سننا چاہتے تھے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس جواب ہی کیا تھا۔ میں نے جیب سے ایک خط نکال کر پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

"بات صرف اتنی تھی۔ بھابی کو غلط فہمی ہوئی۔ سہیل کی یہ تصویر پچھلے سال کالج کے ڈرامہ کی ہے جو اس نے مجھ سے منگوائی تھی۔ بھابی سر ہو گئیں تو پھر میں کیا کرتا۔"

بھائی صاحب نے پہلے خط کو بہت بلند آواز سے پڑھا لکھا تھا۔

پیارے جمشید!

آپ پچھلے سال کالج میں جو ڈرامہ ہوا تھا اس میں میں نے صفیہ کا فیمیل پارٹ (.......) ادا کیا تھا۔ ہیروئن کی حیثیت سے میرا پارٹ بہت کامیاب رہا تھا جس کی ایک تصویر میں نے تم کو بھیجی تھی۔ میرے پاس اس

کی کوئی کاپی نہیں ہے اگر تمہارے پاس ہو تو بھیجو۔ اس کی دوسری کاپی کروا کے واپس کر دوں گا۔

تمہاری سہیل (صفیہ)

بھائی صاحب نے خط پڑھ کر تصویر اور خط میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ آج کل کے لڑکے میں کہتی ہوں کتنے شریر ہوتے ہیں۔" امی جان ہنسی دبائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بھابی سوالیہ نشان بنی ہوئی رو رہی تھیں ہنسی ہنس رہی تھیں اور میں بیگم کو منانے میں مصروف تھا۔

بھلے آدمی

چوراہے پر — فتحپوری — چاندنی چوک!

جس طرح کسی ووٹر کو دیکھکر امیدواروں کے ورکرز دوٹ چھین لینے کے لئے دوڑتے ہیں — بالکل اسی طرح تانگے کے اڈّوں پر سواریوں کو دیکھ کر ہلچل مچ جاتی ہے — ہر تانگے والا یہی چاہتا ہے کہ جلدی سے جلدی سواری بٹھا کر اپنا تانگہ بڑھا دے۔

ــ برقعہ پوش عورت دھیرے دھیرے تانگوں کے اڈّے پر پہونچ چکی تھی — تانگے والوں نے گھوڑوں کی راسیں تاننا شروع کر دیں —!

ــ آیئے — میں جارہا ہوں ــ

ــ ادھر آیئے کہاں جانا ہے — آپ کو ــ

ــ بیگم صاحبہ — فرسٹ کلاس ہے تانگہ ــ

ــ اس تانگے پر — ادھر کہاں جارہی ہیں — آپ ــ

مجید کے دماغ پر ایک زور سے گھونسہ لگا جیسے — تاڑی کے نشے میں چور آنکھیں چمکنے لگیں — یہ کل کا لونڈا سلامت — میری سواری کو ہتھیا لے جانا نہیں — کہ استاد مجید اسے دشمنی مول لینا عقل داروں کا کام نہیں —

تاڑی کے نشہ میں وہ بدمست ہو رہا تھا ـــــ للکارا !

"وہ جا بے بوڑھے ـــــ ہوش کی باتیں کر ـــــ جانتا نہیں ـــــ میں

ہوں استاد مجیدا ۔"

"ہاں ہاں جانتا ہوں ـــــ سلامت نے بے پروائی سے جواب دیا ـــ

تو استاد ہوگا جس کا ہوگا ـــــ میرا کیا اکھاڑ لے گا ۔"

"میں کہتا ہوں ۔ ـــــ مجیدا بولا ـــــ سلامت کے بچے! تو میری

سواری کو کیوں ورغلا رہا ہے ۔"

"ابے مجیدا کے بچے ـــــ سلامت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔ آج کچھ

زیادہ تو نہیں پی گیا ـــ جو آنا ناپڑ رہے ہو ۔"

"زبان نہیں رکتی تیری ـــــ بتلا دوں آکر تجھے ـــــ مجیدا نے آستینیں

چڑھالیں ـــــ !

"ابے چل ـــــ اپنا کام کر ـــــ سلامت کہنے لگا: بنا پھرتا ہے

استاد کی دم ـــــ بیگم صاحب آجاؤ کہاں جانا ہے ـــــ !

نہیں سنتا حر... ... ! ...... ! مجید اترتا ۔ آتا ہوں ۔

قریب تھا کہ سلامت بھی اپنے تانگے سے نیچے اتر آئے ۔ اور موٹی موٹی

گالیاں جابکوں کی بوچھاڑ میں کھو جائیں ۔ برقعہ پوش عورت لپک کر سلامت کے

کے تانگے پر پہنچ گئی ـــــ وہ مظلوم تھا ـــــ ساری خطا مجیدا ہی کی تھی ـــ برقعہ

پوش عورت نے یہی سمجھا شاید !

چل بیٹا ! سلامت نے راسیں تان دیں ـــــ کہاں جائیں گی آپ ؟

جائیں گی کہاں ——— شکست خوردہ مجید نے اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کیلئے
لقمہ دیا ——— وہیں گوروں کے پاس اور کہاں! اپنے یاروں میں ——— !

تانگہ بڑھ چکا تھا برقعہ پوش عورت جھینپے ہوئے لہجہ میں بولی — نئی دہلی سے
پرے —

سلامت نے آہستہ سے چابک مار کر گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی ———
مجید کھسیانی ہوئی ہنسی ہنس رہا تھا کھڑا۔ گالیاں بک رہا تھا تاڑی کے نشے میں بدمست
——— یکایک تانگے پر بیٹھے ہوئے کسی نے کہا۔

نئی دلی۔

اس نے مڑ کر دیکھا ——— زنانی سواری تھی۔ بالکل تنہا! اس کے دماغ پر
اب بھی سلامت ہی کا خیال مسلط تھا۔ گھوڑے کی باگ موڑتے ہی وہ نئی دہلی جانے والی
سڑک پر پہنچ چکا تھا۔

تانگے کے پہیوں کی طرح سے اس کا دماغ بھی چکر کھا رہا تھا ——— یہ کل کا چھوکرا
——— حرامی۔ کمینہ۔ جانتا نہیں کہ استاد مجید حوالدار تک سے نہیں ڈرتا ——— آج تک
تو کسی سے دبا نہیں ہیں ——— پولیس والے ——— کوٹھی۔ کمیٹی والے بھی جانتے
ہیں کہ استاد مجید [illegible] پانی ایک [illegible] ہے ——— [illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]

[illegible] نے پیچھے سے [illegible] دیا ——— [illegible] جیسے چونک پڑا ———
داہنی طرف تانگہ کو موڑتے ہوئے ——— [illegible] ——— ایک جھٹکے سے [illegible] پیچھے بیٹھی ہوئی زنانی سواری
پھڈالی۔ جس کے چہرہ پر نقاب [illegible] میں [illegible] تھا۔

بیگم صاحب۔ وہ کہنے لگا ——— [illegible] ——— [illegible] پانی ہوتے ہیں

ــــ دس دن ایک تانگے سے لاری لڑا دی ایک نے ۔ سواریاں تو بچ گئیں ــــ پر ــــ پر ۔ تانگے کے پرانچے اڑ گئے ــــ جیسے یہ سڑکیں ان کے باپ کی خریدی ہیں ــــ اور ہم لوگ جو ہر سال کمیٹی کو ٹیکس دیتے ہیں ــــ بیس روپیہ سال ــــ اور پھر ــــ پولیس اور کمیٹی والوں کی بیگار الگ ۔ پر غریبوں کی کون سنتا ہے بڑے آدمیوں کا راج ہے آج کل ۔

سرکار ــــ مہنگائی کا یہ حال ہے ــــ کہ تانگے کی ربڑ جو دو روپیہ فٹ ملتی تھی پہلے ، اب چھ روپیہ فٹ بکتی ہے ــــ دانہ پہلے تو دو پیہ بیس آنے میں آتا تھا ــــ سرکار ! اب ــــ اب ــــ یہ جان لیجئے کہ پورے پانچ روپیہ روز میں گھوڑی کا پیٹ نہیں بھرتا ــــ کوئی بال بچوں کو کیا کھلائے ۔

برقعہ پوش ، عورت خاموش بیٹھی ہوئی دوسری طرف دیکھ رہی تھی ۔ جیسے تانگے والے کی باتوں میں کوئی مزا ہی نہ تھا ۔

مجید اتنے تانگہ ہانکتا ہوا بکتا چلا جا رہا تھا ــــ سڑک پر غیر معمولی بھیڑ تھی ــــ سینما کا میٹنی شو آج ذرا کچھ دیر سے ختم ہوا تھا ــــ شاید لڑائی کی ریل کچھ لمبی تھی ۔ سیکڑوں آدمی آنکھیں ملتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے جا رہے تھے ۔ مجید اچھلا رہا تھا ۔

ہٹو ــــ بچو !

بابو جی ــــ بابو جی !

سردار جی ــــ بابو جی !

اور پکچر ہاؤس سے نکلتے ہوئے تماشائی ــــ پردۂ فلم پر ناچتی ہوئی تصویروں کی طرح ناچ رہے تھے ۔ تصورات کی دنیا میں ــــ تخیلات کی دنیا میں ــــ ہر شخص

دیکھی ہوئی تصویر پر رائے زنی کر رہا تھا اور بعض منچلے ہلکے ہلکے سروں میں سنے ہوئے گانوں کی دھنیں اپنے گلے میں اتار رہے تھے۔

"اچھا جی ــــ اچھا جی ــــ ہماری گلی آنا ــــ اچھا جی۔"

"ہماری گلی آنا ــــ اچھا جی۔"

"ہمیں نہ بھلانا ــــ اچھا جی ــــ اچھا جی!"

"شہر کی لونڈیا ــــ شہر کی لونڈیا۔"

"اچھا جی ــــ ہماری گلی آنا!"

"ہمیں نہ بھلانا ــــ اچھا جی ــــ اچھا جی۔"

تانگہ بھیڑ کو چیرتا ہوا چلا جا رہا تھا ــــ جیسے کوئی تیراک ندی کی موجوں میں دونوں ہاتھوں سے راستہ کر رہا ہو۔ پکچر ہاؤس کے لمبے چوڑے سائن بورڈ مسکرا رہے تھے۔ فلمی پریوں کی خاموش تصویریں مسکرا رہی تھیں اور تانگہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا ــــ

ہٹو ــــ بچو ــــ مجیدا نے کہنا شروع کر دیا۔

میں اگر بائسکوپ نہ دیکھوں ــــ تو نیند ہی نہیں آتی ــــ چونی روز کی بندھی (ہچکی)، ہوئی ہے! پیسہ ــــ پر (ہچکی)، اب تو کوئی اچھا تماشہ آتا ہی نہیں (ہچکی)، ــــ ایکدن ــــ ایک دن ــــ بھوارے پر (ہچکی)، میں نے دیکھا تھا ایک تماشہ (ہچکی)، بس آپ سے کیا کہوں! میری چونی (ہچکی)، تو جدھی (جبھی)، وصول ہو گئی (ہچکی)، جب اس نے اس لونڈیا کو چٹاخ (ہچکی)، پٹاخ کیا۔

مجیدا نے پیچھے سے مڑ کر سواری پر نظر ڈالی جس کے برقعہ کا نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا۔

کناٹ پلیس سے نکلتے ہوئے اُس نے دیکھا ـــــ دیکھا کہ سلامت کا تانگہ کوئی آدھ فرلانگ پر جا رہا ہے۔ اے۔ آر۔ پی کے شیڈز کے نیچے بجلی کے بلب نگاہیں جھکائے ہوئے جھانک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی مدھم سی روشنی چاند کی سفید روشنی میں کھو سی گئی تھی ـــــ سلامت کا تانگہ فرّاٹے بھرتا چلا جا رہا تھا موٹروں کی زد سے بچتا بچاتا ـــــ تانگے کے پیچھے بیٹھی ہوئی برقعہ پوش عورت نے اپنے چہرہ کا نقاب الٹ دیا تھا۔ واقعی کتنا جھنجھٹ ہیں یہ آج کل کی نقابیں بھی ـــــ ساری دنیا نقاب کے جال میں چکراتی دکھائی دیتی ہے ـــــ نقاب کی بہین جالی گھنی پلکوں میں الجھ جاتی ہے اکثر ـــــ اور جو نقاب ہوا میں اڑنے لگے تو پھر ـــــ بالکل بیکار!

سلامت ـــــ ٹخ۔ ٹخ۔ ٹخ کر رہا تھا۔ مجیدا کے کانوں میں یہ آواز پہنچی ـــــ اس کا گھوڑا۔ دلکی۔ جا رہا تھا ـــــ ایک چابک مار کر اس نے راسیں تان دیں ـــــ بے زبان گھوڑے کی رفتار تیز ہو گئی۔ ـــ مجیدا تن کر بیٹھ گیا۔

بھینا چوکے جا رہا ہے سالا! قدم نہیں کا ـــــ کمائی کھاتا ہے ـــــ کمائی ـــــ بھینا کی کمائی!

مجیدا کی آواز ہوا میں جا رہی تھی ـــــ اور چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی شعاعیں اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں ـــ اس نے تانگے کے پہیوں پر چابک لگا دیا آواز آنے لگی،

ترر۔ ٹرر۔ ٹرا۔ ٹا۔ ٹا۔ ٹرا!

پیچھے بیٹھی ہوئی برقعہ پوش عورت نے جھک کر پہیوں کی طرف دیکھا ـــــ اور اس نے نقاب الٹ دیا۔

سلامت کا تانگہ قریب آچکا تھا ۔۔۔ مجید نے آنکھیں پھاڑ کر سلامت کے تانگے پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کبھی اس نے عورت کو دیکھا ہی نہیں ہے۔

اچانک اس کی نظر سلامت پر جا پڑی ۔۔۔ اور تاڑی کا نشہ پھر عود کر آیا۔!

"چل بیٹا ۔۔ لونڈے کو ہرے ذات بتائی۔

سلامت اپنے تانگے پہ گنگنا رہا تھا۔

"جنگی کا زمانہ ہے۔"

"اے ۔۔ وال ادھاں جاؤں ۔۔۔ جنگی کا زمانہ ہے!"

"ہاں ۔ ہاں ۔۔ جنگی کا زمانہ ہے!"

مجید کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

"اے بے قلطبان جینا ۔۔۔ کو لئے جا رہا ہے ۔۔۔ گوروں میں ۔۔ کمائی کھاتا ہے ۔۔"

اب سلامت نے بھی مڑ کر دیکھا ۔۔۔ مجید ایک رہا تھا اول فول۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

" وستاد ۔۔۔ مانو گے نہیں ۔۔۔ اتار دوں گا ۔۔۔ تاڑی کا نشہ بھی ۔۔۔

۔ ڈر دیکیا ۔۔۔ تو اپنی ماں کو لئے جا رہا ہے گوروں میں ۔"

ہوا کی سنسناہٹ میں سلامت کی آواز کھو گئی شاید ۔۔۔ مجید پوری بات نہ سمجھ سکا۔ کہنے لگا۔

"ہاں ۔۔ ہاں! بھلے آدمی یہی کرتے ہیں ۔۔۔ نا! جو تو کر رہا ہے ۔۔۔

غلطبانی —— قرمی!

سلامت کا تانگہ تیزی کیساتھ بڑھتا چلا جارہا تھا۔ کیونکہ مجیدا کے تانگے کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ اور وہ شائد داہنی طرف سے کتاکر اپنا تانگہ آگے نکال لینا چاہتا تھا —— کتنی تُنکی تھی اس میں سلامت کی —— اور اس کے سبزے کی —— جس کو اس نے ابھی حال ہی میں بارہ سو کا خریدا تھا —— سب ملاکر دو ہزار سے زیادہ خرچ ہوئے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ مجیدا اپنا تانگہ بڑھا کر نکال لیتا۔

دونوں تانگے تیزی سے بڑھتے جارہے تھے —— چاروں طرف سناٹا تھا —— البتہ کبھی کبھی کوئی موٹر تیزی سے ہارن بجاتی ہوئی نکل جاتی —— یا کوئی آدمی سائیکل پر ——!

بڑی سڑک سے نکل کر سلامت نے اپنا تانگہ ایک سنسان سڑک کی طرف موڑ دیا —— مجیدا کا تانگہ بھی پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا۔ تانگے پر بیٹھی ہوئی سواریاں بالکل مطمئن تھیں کہ ٹھیک راستے پر جارہی ہیں —— مجیدا کا نشہ اب کچھ کچھ اتر چلا تھا اور وہ دھیمے دھیمے سُروں میں گنگنانے لگا تھا۔

آئے بھی وہ —— گئے بھی وہ —— ختم فسانہ ہوگیا۔
آئے بھی وہ —— آئے بھی وہ..........!

سڑک کے دونوں طرف میدان تھے —— شائد یہ ویرانے پارکوں کی شکل میں بدل دئے گئے تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے نیچے ہرے ہرے لان پر چاند کی شعاعیں پتوں سے چھن چھن کر رہی تھیں۔

دونوں گھوڑے دوڑتے دوڑتے تھک گئے تھے۔ اس لئے ان کی رفتار

میں خود بخود کچھ آہستگی پیدا ہو گئی تھی۔

سلامت کے تانگے پر بیٹھی ہوئی برقعہ پوش عورت نے آہستہ سے کہا۔ رُک جاؤ ۔۔۔۔

سلامت نے کنارے کی طرف تانگہ روک دیا ۔۔۔ اس نے آہستہ آہستہ سلامت سے کچھ اور کہا۔ جانے کیا۔ پارک کے اندر اندر وہ کنارے کنارے چلنے لگی۔

مجید کا تانگہ بھی وہیں قریب ہی آ کر ٹھہر گیا۔

یہیں ٹھہرو ۔۔۔ آتی ہوں ابھی ۔۔۔ اس نے اپنا برقعہ اتار کر تانگے پر رکھ دیا اور اسی پارک میں چلی گئی۔

مجید نے دیکھا ۔۔۔ پارک میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ۔۔۔ قد آدم جھاڑیوں پر گلابی نیلے اور کاسنی پھول چاندنی میں ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ جن کے پاس ہی پڑی ہوئی لوہے کی بنچوں پر قہقہے کھیل رہے تھے۔ سنہرے قہقہے۔ کچھ پھیکے سے ۔۔۔!

سلامت نے جیب سے بیڑی کا بنڈل اور ماچس نکالکر ۔۔۔ ایک بیڑی سُلگائی

مجید اب تک پارک ہی کی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔۔ ماچس کی روشنی نے یکایک متوجہ کر لیا ۔۔۔ اس نے مڑ کر سلامت کی طرف دیکھا آج تاڑی کے نشہ میں وہ بیڑی کا بنڈل بھی بھول گیا تھا ۔۔۔ سلامت کے منہ سے دھوئیں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

خود بخود مجید کو جماہیاں آنے لگیں۔

۔ لانا ۔۔۔ ایک بیڑی اِدھر کو ۔۔۔ مجید بولا۔

سلامت نے بیڑی اور ماچس نکال کر بڑھا دی مجیدا کی طرف ۔ اور منہ پھیر کر دوسری طرف دھواں اڑانے لگا۔ مجیدا نے بیڑی سلگا کر ماچس واپس کرتے ہوئے کہا ——!

آج تو میں بالکل "ڈاؤن" ہو گیا تھا —— بہت پی لی تھی! کوئی چار گھڑیاں! جانے کتنی دیر لگے گی۔ میں تو گیارہ بجے کھول دیتا ہوں —— پر فردوسی اچھی ملتی ہے ان سے۔

سلامت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجیدا کہنے لگا۔

ہم کو کیا —— کوئی کچھ کرے —— یہاں اپنی فردوسی سے غرض۔ سلامت نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا —— مجیدا اپنے تانگے کی اگلی سیٹ پر آکر لیٹ رہا۔ سلامت نے پہلی بیڑی ختم کر کے دوسری بیڑی جلائی اور وہ بھی اپنے تانگے پر چلا گیا۔

کئی منٹ تک موت کی سی خاموشی چھائی رہی —— شاید مجیدا کی آنکھ لگ گئی تھی۔ یکایک چونک کر بولا۔

کیا بجا ہو گا سلامت؟

سلامت کو جاگ رہا تھا مگر کچھ نہ بولا۔

سلامت! مجیدا نے پھر پکارا —— کیا سو گیا؟

کیا بکواس لگائی ہے —— سلامت نے جھنجھلا کر کہا۔ چپکے کیوں نہیں رہتے!

آدمی ہے یا جانور —— مجیدا بولا —— بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔

تیری بات کا کیا جواب دوں! ــــ سلامت نے کہا ــ تو بوسشہ ہیں ڈوکن ہو سکے۔

پی تو گیا تھا زیادہ ــــ مجیدا نے جواب دیا ــ پر اب نشہ نہیں۔

وستاد ــــ سلامت کہنے لگا ـ آج تم نے گالیاں دی ہیں ـ یاد رکھنا ــــ وستاد!

کون ــــ میں نے! مجیدا بولا ــــ تم کو گالیاں دیں میں نے! کون کہتا ہے! جھوٹ شائد نشے میں ایک آدھ بات نکل گئی ہو منہ سے ــــ جانے بھی دے! بھلے آدمی برا نہیں مانتے ایسی باتوں کو ــــ ہاں یہ تو بتا مزدوری کیا طے ہوئی!

میں نے تو کچھ طے وے نہیں کیا ــــ سلامت نے کہا ـ پر پیسے اچھے ہی ملیں گے!

اچھا بڑی پلا ایک! مجیدا نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا ــــ یہ خانگیاں تو چاوڑی کی رنڈیوں سے بھی بڑھ کر ہیں ـ سچ پوچھو تو ــــ!

ہو گا ــــ سلامت بولا! ہمیں تو اپنے پیسوں سے کام ....!

چاند کی دھیمی دھیمی روشنی تانگوں کے اندر جھانک رہی تھی ــــ اور سامنے پارک کی لان پر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جھاڑیوں کی چھاؤں میں سائے پرند کر رہے ہیں ــــ!

لفٹ ـ رائٹ ـ لفٹ ـ رائٹ ـ لفٹ ـ رائٹ ـ کوئیک مارچ ــــ!

کچھ ہلکی ہلکی سی آوازیں اور قہقہے ! فضا میں گونجتے معلوم ہو رہے تھے۔
دھیرے دھیرے دو سائے پارک کے اس سرے پر آتے ہوئے دکھائی
دینے لگے۔ لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں گھاس پر تیر رہے تھے۔ نگاہوں میں ایک
بےحجابانہ چمک۔

دونوں تانگوں کے قریب آ چکی تھیں —— ننگی ساریاں برقعوں میں
چھپائی جا رہی تھیں —— الجھے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے —— اور سلامت
ہلکے ہلکے سُروں میں گا رہا تھا۔

ہنسی کا زمانہ ہے —— اے دل کہاں لیجاؤں!
اے دل کہاں لیجاؤں ہنسی کا زمانہ ہے ——!

"لڑکیوں نے اب دفعان ہو چکو ــــ یہاں سے ؟"

صبح صبح ہم لوگوں کے کان پھوٹنے لگے ــــ اماں بی کہہ رہی تھیں خالہ بی کمرے میں چوکے پر بچھی ہوئی چاندنی پہ لگا کر بیٹھنے والے گاؤ تکیوں کے غلاف درست کر رہی تھیں ۔ اور ہوتا بھی یہی تھا کہ جس دن کوئی مہمان آنیوالا ہوتا سارے گھر کی ۔ الٹ پلٹ ۔ کرنا پڑتی ۔ پچھا کبھی کمرے سے دالان میں کبھی دالان سے کمرے میں لایا جاتا ۔ سنگھار میز آئینہ کے کمرے سے منجھلی بی کے کمرے میں اور کبھی تبدیلی آب و ہوا کے لئے صحن میں ۔ پلنگ کبھی اتر سے دکھن اور پورب سے پچھم بچھا دئے جاتے ۔ اور کبھی اپنی اصلی جگہ پر آکر اس طرح دیکھ جاتے جیسے ان کی پہلی روش میں زیبائش کی زیادہ جاذبیت اور کشش تھی ۔ پاندان اگالدان ، ہاتھ دھونے کی سلفچی ، گھڑوں کے بچپڑے ، شیشوں کے پانی گلاس صوفے اور چلمن ، کرسیوں کے گدے سب کے سب ۔ انقلاب زندہ باد ۔ پکارنے لگتے البتہ ہم لوگوں کی کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان رحل کلام پاک سمیت ہم لوگوں کی تعلیم کے پروپیگنڈے کے لئے بالکل اسی طرح برآمدے میں سجا دیا جاتا جیسے دکاندار اپنی دکان کا بیش قیمت سامان دکھاوے کے لئے شوروم میں سجا دیتے ہیں ــــ اور ــــ وہ یہ سب کام مجھے ، آپا اور بیچاری بتو بی کو کرنا پڑتے ۔ پھر خالہ بی کے کوسنے ــ ــ مر رہی

نہیں چکھتیں ـــــ موا یہ گھر ہے کہ میونسپلٹی کا کوڑے تھا ـــــ میری پوتی سے ـــــ
اے نوا ـــــ جیسے موا میرا ہی پیام آنیوالا ہے ـــــ میں تو کہتی ہوں بس
چودہویں صدی کی لڑکیاں ـــــ اے نوج ہم ایسے ہوتے اسے ہے بیوی اس
زمانے کی لڑکیاں ۔ توبہ توبہ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے ان کی ۔ خدا کی پناہ برابر
دیدہ سے دیدہ لڑائے رہتی ہیں ـــــ اللہ کی مار مُردیوں کی صورتوں پر ۔
پڑی رہو گی جنم بھر یونہی ـــــ کوئی پوچھے گا بھی نہیں"

اماں بی کا ہے کو خاموش رہتیں آخر بھیں تو بہن ہی خالہ بی کی کہنے لگیں ۔
"ناہن! میں نے تو ایسی لڑکیاں دیکھی ہی نہیں ان کا بوچہ سب سے اونچا ۔ نگوڑیاں
آج کل والی ۔ توبہ الٰہی اگر ہم لوگوں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے تو اماں جان زندہ
ہی دفن کر دیتیں ۔ مگر اب دیکھتی ہوں نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ ۔ شرم و
حیا چھو تک نہیں گئی ۔ گن ڈھنگ ایسے کہ آفت بیٹیوں کو کوئی پاس بھی نہ کھڑا ہونے
دے اور پھر یہی تو ہے کہ ہم لوگ جھینکتے ہیں اور کمبختوں کا ٹھکانا نہیں لگتا ۔ زندگی اجیرن
ہے ـــــ الٰہی توبہ ـــــ بارالٰہا ایسی زندگی سے موت دیدے ۔

گویا اس میں ہمیں سب کا قصور تھا کہ ہم لوگوں کے بیاہ نہیں ہوتے ۔ پیام آتے
ہیں تو طے نہیں ہوتا لڑکے والے دان جہیز مانگتے ہیں ۔ میٹرک اور بی ۔ اے کے سرٹیفکیٹ
دیکھنا چاہتے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے کہ بڑی لڑکی شکل و صورت کی تو اچھی ہے مگر ذرا عمر
زیادہ ہے ۔ ہاں منجھلی کا ذرا قد چھوٹا ہوتا تو ـــــ اور چھوٹی ذرا مطلب یہ کہ کالی یعنی
ذرا سانولی ۔ اماں بی اور خالہ بی طرح طرح کی "کنوینسنگ" (Convincing) کرتیں
رضو کی عمر ہی کیا ہے ابھی ۔ بیوی سچ پوچھو تو ابھی میرا ارادہ ہی نہیں ہے کرنے کا ۔

—— لیکن ۔۔۔ وہ اپنی بیماریوں کی وجہ سے بہت گھبراتے ہیں۔ ویسے پیام تو بہت آئے اور آج بھی آتے ہیں مگر کچھ حسب نسب کا جھگڑا پڑ جاتا ہے —— بہن میں تو کہتی ہوں لڑکا اچھا ہے غریب ہی کیوں نہ ہو مگر خاندانی ہو —— ۔

"ہاں صاحب"۔ خالہ بی تائید مزید فرماتیں۔ "ہم کو تو اور کچھ نہیں چاہئے بس خاندان اچھا ہو۔ کھاتا پیتا —— ۔"

"جی ہاں۔ مڈل تو چھوٹی بھی پاس کر چکی ہے۔"

منجھلی کے لئے —— تو اچھے بھائی بہت زور دے رہے ہیں اپنے جاوید کیلئے۔ اللہ رکھے امسال تو اس نے وکالت پاس کی ہے۔"

"ناہید چھوٹی تو ابھی بہت کم سن ہے اور پڑھ بھی رہی ہے اس کے علاوہ وہ تو منگیتر بن چکی ہے اپنے ماموں کے گھر۔ لڑکا ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینے والا ہے۔

"کئی برس سے کانپور کے حسن علی صاحب رضو کیلئے کہہ رہے ہیں۔ ان کا ایک ہی لڑکا ہے، جائداد بہت کچھ ہے۔ گاؤں گراؤں کوٹھیاں مکانات سبھی کچھ مگر دولہا بھائی راضی نہیں۔ لڑکا فوج میں نوکر ہے۔ سیکنڈ کپتان ہے۔

"اے ہے دیکھو۔ چائے ... آپ تو بڑا تکلف کرتی ہیں۔ یہ نمکین ... یونہی رکھے ہیں لیجئے بسم اللہ۔"

"نہیں معاف کیجئے۔ ہمارے یہاں یہ دستور نہیں ہے جب ایسی بات چیت کیلئے جاتے ہیں تو نمک تک نہیں چکھتے۔"

"واہ بھئی واہ! یہ آپ کے یہاں کی نرالی رسم ہے وہ تو آپ ہی کی لڑکی

ہے۔ اب یہ باتیں پرانی ہو چکیں۔

"جی۔ لڑکی۔ لڑکی دکھانے میں تو کوئی عذر نہیں۔ وہ تو آپ ہی کی ہے مگر ہمارے یہاں اسکو عیب سمجھا جاتا ہے۔"

"اے ہے تو اس میں کونسا ہرج۔ عیب تو جب ہوتا جب میں کسی غیر جگہ سے آئی ہوتی۔ ہم آپ ایک ہی جگہ کے رہنے سہنے والے۔ پر میں نے تو اسے جب وہ چھوٹی سی تھی دیکھا بھی ہے۔ اب بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔"

"نا بہن اس معاملہ میں آپ ضد نہ کریں۔"

"اچھا خیر جانے دیجئے۔"

بجو نے آپا کے ٹہوکا دیا۔

"جاؤ تمہارا پیام آیا ہے۔"

"مگنو۔ نہیں۔ میری نہیں! تمہاری بات چیت ہے۔ وہ جو ابھی کہہ رہی تھیں کہ دو تین سال میں دارالعلوم سے پاس کر کے فارغ التحصیل ہو جائیگا"

"فارغ التحصیل" کو آپا نے قرأت سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اے نوج۔" بجو بولیں! "میں کاہے کو اس موئے نکھٹو مولوی سے بیاہ کرنے لگی۔ وہ چڑی کا غلام آپ ہی کو مبارک۔"

آپا جھینپ گئیں۔ "تو شائد شفو کیلئے کہہ رہی ہونگی مولویائن۔"

میرے تن بدن میں چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔

"اے اُدہی! میرا جوڑ کیوں ملاتی ہو اُس موئے بن مانس سے۔ خدا

"شفوّ سچ کہتا! اباجان کہہ نہیں رہے تھے اسدن اماں بی سے کہ رفو کے لئے وہ کئی بار آ چکے ہیں جو یہاں کے ایک بڑے جنرل مرچنٹ ہیں"
آپا نے مجھے ثبوت میں طلب کرلیا۔
"ہاں بجّو کہتی تو سچ ہیں آپا۔ عجائب خانہ کا بھالو کئی مرتبہ آچکا ہے" میں نے سچ سچ بیان کردیا۔
بجّو بگڑ گئیں "اے لو۔ سوپ تو سوپ چھلنی بھی بولی جس میں بہتّر چھید۔ میری نبّو بھی اسی طرف ہو گئیں۔ پہلے تم اپنی خبر لو۔ تمھارے وہ حکیم جی! " آپا کھلکھلا پڑیں۔
"یہ بھی اچھّی رہی ۔ رو رہی ہیں اس مسے خولّق کو۔ ایسی چاہت بھی کیا ہاں کی بہت بڑی تم پر شفوّ۔ خدا خدا کرو" آپا کہنے لگیں۔
"اے میں کیوں اس میّت کو روتی رونے رو تم جو اپنے بیاہ کیلئے بیقرار ہو۔ وہ موا سڑک کوٹنے کا انجن میرے پلے کیوں پڑنے لگا۔ یا تو تمھارے ساتھ ہو گا یا بجّو کے ساتھ۔
"بولے اپنا پاپ اوجھ میرے اوپر ڈال دیا۔ سٹرن کیوں ہوئی جا۔ یہی ہے تیرا بھی ہو جائے گا جلدی ہی کا ہے کی بات"
"آفت پٹیو چپتی نہیں" خالہ بی نے کمرے میں آ کر ایک دو ہتڑ مارا تو میری اور بجّو کی کمر اور آپا کے ہاتھ پر لگا۔ اور ہم تینوں اوندھے سیدھے ایک دوسرے پر جا پڑے۔۔
ابھی ہم لوگ چپ چاپ دم سادھے پڑے تھے کہ ہوائی خطرہ دور ہو جانے کی گھنٹی بجی۔
"اے کھِل کیوں نہیں جکتیں اب۔ کیا سب کو سانپ سونگھ گیا؟"
"خالہ رجز خواں تھیں ۔ ۔ اے نوج بہن خدا نہ کرے کسی کی ایسی اولاد ہو۔ اللہ

ہو بھی تو پیدا ہوتے ہی مر جائیں۔"

اماں بی قطع کلام کرتے ہوئے دخل در معقولات تک پہونچ گئیں۔

"اے مجھے تو اس مولویانی کی آتی ہے! آئیں تھیں پیام لیکر جیسے کسی کی لڑکیاں بھاری ہیں جو جھونک دیگا اس جہنم میں۔ موئے کفن کھسوٹ کہیں کے — میری لڑکیاں اور ان کا منہ اللہ تیری شان —"

"نہیں باجی" خالہ بی بولیں — "برا ماننے کی بات نہیں جس کے گھر میں بیری ہوتی ہے ڈھیلے آتے ہیں۔"

ہم تینوں بیریاں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اباجان کھانستے ہوئے داخل ہوئے۔

"کیا طے کیا رضو کی ماں ؟"

"اے میں کہتی ہوں تم کو ہو کیا گیا ہے ؟" اماں بی پانچے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں — "بڑھبس لگا ہے تم کو — تم کو تو یہ لڑکیاں بھاری ہیں — اس موئی مولویانی کو بھیج دیا — خدا غارت کرے میرا دماغ چاٹ گئی۔ اللہ کی مار — نوچ میں اپنی لڑکیوں کو اس مسجد کے ملا سے بیاہنے لگی۔"

"میں کہتا ہوں کہ ہوا کیا — ؟" اباجان معاملہ کی تہ تک پہونچنا چاہتے تھے۔

"ہوتا کیا" اماں بی بولیں — "میں نے صاف صاف جواب دیدیا — کہتی تھیں لڑکیوں کو دیکھوں گی — میں نے کہا — یہ کبھی نہ ہوگا —"

"مگر یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا" اباجان عورتوں کو ناقص العقل ثابت کرنے لگے اب کل ہی بارہ دفعہ سے قمر عالم صاحب کی بیوی آنے والی ہیں۔ وہ تو ضرور دیکھیں

گی لڑکیوں کو۔ لڑکا اچھا خاصہ پڑھا لکھا۔ فیشن ایبل ہے۔ تب کیا ہوگا ؟
ناصاحب۔ میں لڑکیوں کو سامنے نہ ہونے دوں گی چاہے لاٹ صاحب
ہی کیوں نہ ہوں۔

میں کہتا ہوں رضّو کی ماں۔ ابّا جان کہنے لگے۔ تم کو ہو کیا گیا ہے۔
دنیا بدل گئی ہے لیکن یہاں مرغے کی ایک ہی ٹانگ۔ تم وہی پرانی لکیر کی فقیر بنی ہو۔
ارے بھئی دنیا کے ساتھ چلو ___ دیکھو زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ کوئی دمڑی کی ہانڈی لیتا
ہے وہ بھی ٹھونک بجا کر پھر یہ تو زندگی بھر کا ساتھ ہے ___ ذرا سوچو تو رضّو کی ماں
آپا نے بجّو کے ٹہوکا دیا۔ بجّو نے میرے چٹکی لی۔ اماں بی کچھ اور کہنے والی
ہی تھیں کہ خالہ بی ثالث بالخیر بن کر آ پہونچیں ___

اے ہے دولہا بھائی ___ میں کہتی ہوں تمہیں بڑھاپے میں ہو کیا
گیا ہے۔ تمہاری تو وہی مثل ہوئی۔ بارہ برس دلّی میں رہے بھاڑ جھونکتے رہے،
کہاں سے لے آئے تھے اس موئی سوکھے کی بیماری کو۔ کیا یہ لڑکیاں ایسی ہی بھاری ہیں
تم پر۔ اللہ نہ کرے میرے جیتے جی یہ کبھی نہ ہوگا کہ ان کو اس طرح نیگ لگا دیا جائے۔
یکایک خالہ بی کی نگاہ ہم تینوں پر جا پڑی اور محاذ جنگ کا رخ بدل گیا ہے۔
بے غیرتو بیٹھی سن رہی ہو ___ چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتیں ___ اے
لو ایک یہی باقی تھا۔ کہ باوا اور میاں کی زبانی یہ سب کچھ بھی سن لو ___ سو وہ بھی ہو گیا۔
اور میں تم کو کیا کہوں ___ دولہا بھائی ___ بس جیسی وہ ویسے تم۔ خوب ہی پیوند سے
پیوند گٹھا ہے وہ بھی سٹھیا گئی ہیں اور تمہیں بھی بڑھبس لگا ہے۔
مردیو ! ___ دفن نہیں ہو چکتیں۔ چلو دور ہو میری نگاہوں سے

سامنے سے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اماں بی باورچی خانہ کی طرف اور ابّا جان باہری نشست گاہ کی طرف کھسک گئے۔ ہم لوگ شکست خوردہ فوج کی طرح کمرے میں۔۔۔ اور خالبی وہ اپنا خطبۂ صدارت مکمل کرتی رہیں۔!

راجن پور کے زمیندار گھنشیام سنگھ بڑے خاندانی جنولر ہوا کرتے تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کے دادا نے کئی لڑائیوں میں نواب برجیس قدر بہادر کا ساتھ دیا تھا۔ جس کی پاداش میں ان کے بہت سے گاؤں گراؤں " ضبط کر لئے گئے تھے اور باغی ہونے کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے "بلیک لسٹ" میں آگیا تھا۔

راجن پور اور اس کے آٹھ دس پُروے بڑی مشکل سے بچ سکے تھے جن کا انتظام گھنشیام سنگھ کے باپ رام سنگھ کے نام سے ہوا تھا۔ جو رام سنگھ کی نیک چلنی، خوش سلیقگی اور جانفشانی کی وجہ سے ان کے سارے کنبہ کے بافراغت زندگی کیلئے کافی تھے —

رام سنگھ جتنا معاملہ فہم، منصف مزاج، سلیقہ شعار آدمی تھا۔ گھنشیام سنگھ اتنا ہی بدچلن، بدسلیقہ اور بدکردار انسان ثابت ہوا۔ باپ دادا کی جمع کی ہوئی گاڑھی کمائی بڑی بیدردی سے لٹانے کے بعد زمینداری پر بھی قرضہ ہو چکا تھا۔ سات ہل کی سیر گھٹتے گھٹتے چار ہی ہل کی رہ گئی۔ بڑے بڑے سرسبز اور گھنے باغ کوڑیوں کے مول بیچکر کٹوا دیئے؛ پھر بھی گاؤں کے پرانے اور خاندانی چھتری ہونے کی وجہ سے ان کی چوپال میں ہر وقت دس پانچ آدمی جمع رہتے اور برابر ایک آدھ چلم بھری ہی رہتی۔ اکثر

ٹھاکر اونچے لہجے میں غدر کے زمانے کے سُنے سنائے واقعات اور جرمنی کی پُرانی لڑائیوں کے قصے اس طرح بیان کرتے جیسے میدانِ جنگ میں وہ خود موجود تھے! "مہابھارت" کے واقعات کو سچ ثابت کرنے کیلئے اور "ارجن" کے پھینکے ہوئے "بان" کے وجود پر آج کل کے "بموں" اور ہوائی جہازوں کی مثالیں پیش کر کے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی! اپنی گھنی اور لمبی مونچھوں کو سنوارتے ہوئے وہ کہنے لگتے "اور کیوں نہ ہو وہ اوتاروں کے کرتب تھے یہ منشوں کے بکھیڑے!

گوان کے یہاں کوئی باقاعدہ پنچائت قائم نہ تھی لیکن ان کی زمینداری کے تمام مقدمے معاملے اسی چوپال میں فیصل ہوتے جنکو نافذ کرانے کیلئے انہیں کئی بار فوجداریاں کرنی پڑیں۔ بہت سے مقدمے لڑنا پڑے! اور آخر کار ان کی ہیبت چاروں طرف قائم ہی ہو کر رہی۔ ان کے اثر و اقتدار سے پاس پڑوس کے سب لوگ دبتے تھے بخصوصاً چھوٹی قوم والے توان کے نام سے اس طرح ڈرتے تھے جیسے قصائی سے گائے یا پولیس کے ظالم سپاہی سے آبرو دار!

گھنشیام سنگھ تھے تو پُرانے پاپی! لیکن بڑھاپے میں ان کی حرص ہوس اور بھی بڑھ گئی۔ جوانی میں نہ جانے کتنی معصوم اور بیگناہ زندگیوں سے وہ کھیل چکے تھے۔ جس کو تاک لیتے اس کی آبرو بچانا مشکل ہو جاتا! انسان کی سیہ کاریاں ذات پات مذہب و ملت میں کوئی امتیاز نہیں کرتیں! یہی حال ان کا تھا ان کے "پاپ" کے آگے شودر تو شودر بڑے بڑے چھتری سرنگوں ہو چکے تھے۔

نہ جانے کتنے دکھی دلوں کی پکار آسمان کی بلندیوں سے ٹکرا چکی تھی لیکن

جب تک دعاؤں کے قبول ہونے کا وقت نہیں آتا آہوں کی تاثیر کام نہیں دیتی۔ ا
ٹھاکر کے پاپی جیون کے "آنند دوار" ابھی تک کھلے تھے۔ ان کے گناہوں کی زندگی ایک
بھی ہچکی نہ لے سکی تھی۔ انسان کا ضمیر ہے کہ اپنی برائیوں کو بھلائی ثابت کرنے
کیلئے مثالوں اور لفظوں کے حیلے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے! مصیبت کی گھڑیوں میں آ ے
اس جنم کی کرنی یاد نہیں آتی۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اپنے اگلے جنم کے کئے کی سزا مل رہی
ہے۔ یا آئندہ آنیوالی مصیبتوں کی تخفیف کیلئے یہ مصیبتیں آئی ہیں۔ گھنشیام سنگھ نے
بھی اپنی دلہن کے مرنے پر یہی سوچا! ایک لڑکی چھوڑ کر مرنے والی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے
اس کے گھر کو بے چراغ کر گئی۔ لڑکی کا سہارا ہی کیا۔؟ پرایا دھن! پنچھی پکھیرو کی طرح
گھر میں دو گھڑی بسیرا کر کے چلی جائیگی وہ اسے۔ بھگوان کی اچھا یہی کہکر من سمجھا
لیتے! انہوں نے اپنا دوسرا بیاہ بھی نہیں کیا! کبھی بھول کر بھی ان کے دل میں یہ خیال
نہیں آیا کہ جو کچھ ہوا ہے میرے اسی جیون کے کئے کا پھل ہے۔

گھنشیام سنگھ نے اپنے باپ دادا کی نیکیوں میں کوئی حصہ نہیں پایا تھا لیکن
ان کی لڑکی ردّا اپنے باپ کی پوری طرح درثہ دار بنی ہوئی تھی! سارے گھر میں آنکھیں
کھولکر اس نے پاپ ہی پاپ دیکھا تھا۔ اپنے پاپی باپ کی سیاہ کاریوں اور بد چلنیوں
کی بہت سی کہانیاں ادھر اودھر ایکھ کے کھیتوں میں چپکے چپکے اس نے اپنی ان سکھی
سہیلیوں کی زبانی سنی تھیں جنکے ساتھ ہر صبح و شام وہ جنگل جایا کرتی تھی۔

دیہات کی لڑکیاں نیم کے درخت کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں پھر ایسے ماحول
میں رہ کر جہاں ہر وقت اور ہر گھڑی سیکڑوں جوانیوں کے بننے بگڑنے کے قصے بیان کئے
جاتے ہوں۔ اگر جوانی گنگا جمنا کے سیلاب کی طرح نہ آجائے تو کون تعجب کی بات ہے۔

"رددا" کتنی جلدی نوجوان ہوکر بھرپور جوان ہوگئی۔ گھنشیام سنگھ اسے بالکل محسوس نہ کرسکے۔ باپ بیٹی دونوں دو غافل اور انجان مسافروں کی طرح چپ چاپ اپنی اپنی راہ چلے جا رہے تھے۔ جن کو ایک دوسرے کے حال کی کوئی خبر نہ تھی۔ گھنشیام سنگھ نے "نوجوان رددا" کے لئے ابھی تک کسی بر کی بھی تلاش نہ کی تھی۔ ان کی نگاہوں میں اٹھارہ بیس سال کی پہاڑ جیسی جوان لڑکی ابھی دودھ پیتی بچی ہی تھی ---! کبھی کبھی جب ان کی چوپال میں گاؤں کی جوان لڑکیوں کے شادی بیاہ کے قصے چھڑ جاتے تو وہ اپنے ناریل کے حقے سے سلفے کے دو چار کش کھینچ کر ٹھنڈی سانس بھرتے "ہاں اب دو چار سال میں مجھے بھی اپنی رددا کا کوئی بندوبست کرنا ہی ہوگا"

کتنے برسوں سے وہ یہی کہتے چلے آرہے تھے شائد دو چار برس سے ان کا مطلب چالیس پچاس سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ نوجوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنے پر سب سے زیادہ مضبوط استدلال وہ یہ پیش کرتے "کہ کچھ رددا مجھ پر بھار و نہیں ہے"، خوشحال مقدم۔ جیون پاسی اور رستم نقال ان کی ہاں میں ہاں ملاکر اکثر تائید اور تائید مزید کے اہم فرائض انجام دیتے جیسے "ہاؤس آف کامنز" میں کسی خاص معاملہ پر لمبی چوڑی تائیدیں کی جارہی ہوں۔ ٹھاکر کی آنکھیں چوپال کے کونے کونے میں ناچنے لگتیں۔ گویا ہر در و دیوار سے اُن کے اس نیک خیال کی تائید ہو رہی ہے۔

جب کسی کے دانت کے نیچے مُردار دب جاتا ہے تو مشکل سے چھوٹتا ہے۔ بڑھاپے میں تو حرص و ہوس کی آگ اور بھی دہک اٹھتی ہے۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ کی بدکرداریاں بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ نکھر چکی تھیں! یتیم بیاران کا خاندانی مہرواہا۔ تھا۔ اس کا

ویسے بھی " دگا بی " کی دو تین قسطیں لیکر بیاج میں زندگی بھر لیں جو تا گیا۔ اب بچپن سے پیتیم
بھی اپنے باپ کے کئے کی سزا بھگت رہا تھا! بچپن سے کام کاج کرتے کرتے وہ ٹھاکر
کے کنبے میں رل مل گیا تھا۔ ٹھاکر اسے مانتے بھی بہت تھے انہوں نے اسے " دو قسطیں "
دے کر پاس ہی ایک گاؤں میں سورج چمار کی لڑکی " مرلیا " سے اسکا گٹھ بندھن کرا دیا تھا۔
جو اپنی خوبصورتی اور " سُندرتا " میں پاس پڑوس میں بہت مشہور تھی۔ لوگ کہتے تھے
کہ یہ چمار کی نہیں کسی چھتری یا برہمن کی لڑکی ہے۔

روداور پیتیم قریب قریب ہمسن تھے۔ دونوں ساتھ ہی کھیلے کودے اور ساتھ ہی
جوان ہوگئے۔ رودا بچپن ہی سے پیتیم کو چاہتی۔ مگر پیتیم نے کبھی بھولکر بھی یہ نہیں بھلایا کہ وہ ایک
نیچ ذات چمار ہے۔ وہ رودا کو ہمیشہ اپنے مالک کی لڑکی اور اونچی ذات کی کنیا کی طرح
مانتا تھا۔ رودا نے کتنی بار اپنے " نسوانی وقار " کو کچلکر اس کے مردانہ جذبات سے
کھیلنے کی کوشش کی۔ آنکھوں کے اشاروں سے کتنی ہی بار سمجھایا لیکن وہ ایک مرتبہ
بھی اسکا مطلب یا تو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

غریب کی نگاہوں میں پرائی آبرو کی کتنی لاج ہوتی ہے۔ پیتیم کی نگاہیں پکار پکار کر
کہہ رہی تھیں۔ اس نے رودا کی ایک بات کا بھی جواب کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں
دیا۔ نہ جانے کتنی خاموش اور سنسان تنہائیوں میں وہ اپنے مردانہ جذبات سے لڑائی
لڑکر نکل آیا.........اور رودا.........اسے پاپی نہ بنا سکی۔

وہ خوب سمجھتا تھا کہ جس طرح ایک عورت اپنی عزت یا آبرو بچانے کی ذمہ دار ہے
ویسے ہی مرد بھی! پاپ کی سزا عورت اور مرد دونوں کیلئے برابر ہے۔ وہ استقلال اور
پامردی کے ساتھ اپنے مضبوط ارادوں پر اٹل رہا۔ اور رودا اسے برابر پاپ کی دلدل میں

آگ میں جلنے کیلئے اشارے ہی کرتی رہی۔

جب سے ،، مرلیا ،، بیتیم چمار کے گھر بیاہ کر آئی تھی۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ بیتیم پر پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ بات بات پر ڈانٹنا، گالیاں دینا بالکل بند ہو گیا تھا۔ کہاں تو مہینوں اور برسوں اس کی طرف راستہ بھی نہ نکلتے اور اب دن میں دو دو تین تین مرتبہ خود بیتیم کو بلانے جاتے۔ مرلیا ان کے بلانے سے کھنکھارے دروازے چلے آتے پر لمبا سا گھونگھٹ نکال کر دیوار کی طرف منہ پھیر کر بیٹھ جاتی۔ ٹھاکر کے بہت پوچھنے کچھنے پر بھی وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ اتنے دنوں میں اس نے کبھی آنکھ بھر کر بھی ان کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

گانٹھ بونے کا زمانہ قریب تھا۔ ربیع کی فصل بونے کیلئے کھیتوں کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ کچھ رات گئے سے سب لوگ ہل لیکر کھیتوں میں چلے جاتے۔ اور پھر دس گیارہ بجے تک کھیت جوتتے رہتے۔ بیتیم چمار بھی آدھی رات سے مرلیا کو اکیلا چھوڑ کر کھیت چلا جاتا اور اونچی آواز میں دو بیہے ،، کے بول دیہاتی لہجہ میں گا گا کر دوٹتی ہوئی رات گزار دیتا۔ کبھی کبھی ٹھاکر بھی اتنی ہی رات گئے ٹہلتے ہوئے پہنچ جاتے اور کھیت کی مینڈ پر کھڑے حقّے کے دو چار کش کھینچ کر الٹے پاؤں واپس آ جاتے۔

ایک چاندنی رات میں جبکہ سارا گاؤں سو رہا تھا۔ کبھی کبھی پاس کے کھیتوں سے بیلوں کے ہنکانے کی آوازیں آ جاتی ہیں۔ ٹھاکر اپنے گھر سے نکل کر دبے پاؤں بیتیم کے جھونپڑے میں چلے گئے۔ بیتیم چمار تھوڑی ہی دیر پہلے ہل لیکر کھیتوں کی طرف جا چکا تھا۔ ،،مرلیا،، ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑی ہوئی جاگ رہی تھی۔

،، بیتیم ،، قریب پہنچ کر انہوں نے دھیرے سے پکارا۔!

"مرلیا" گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اور لمبا سا گھونگھٹ نکال کر چارپائی سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ ٹھاکر خود اس کے برابر بیٹھ گئے! وہ سکتہ میں رہ گئی۔!

"مرلا" کیا چیتیم گیا۔ انہوں نے پیار کے لہجے میں "مرلیا" کو دلاسا دیتے ہوئے پوچھا!

مرلیا نے پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمت کر کے جواب دیا۔

کھیت گئے ہیں....... چاچا۔

"اٹھتی کیوں ہے بیٹھ جا" ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

مرلیا نے بڑی ہمت کی مگر اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے! اس کے قدم اٹھائے نہ اٹھ سکے۔ زبان رک گئی۔ بدن کانپنے لگا۔ ٹھاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ الٹتے ہوئے کہا۔

"یہ گھونگھٹ کیوں نکالے ہو"

اس کا چاند جیسا خوبصورت چہرہ چمکنے لگا۔ جیسے ساون بھادوں کی اجالی راتوں میں بادلوں کا کونی ٹکڑا ہٹ جانے سے ماہتاب چمکنے لگتا ہے۔ اس کی نگاہیں نہ اٹھ سکیں۔

ٹھاکر کچھ زیادہ بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ٹرن کی چوپال کے پاس سے چند کتوں کے ایک ساتھ بھونکنے اور آدمیوں کے بولنے کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل آئے لیکن چلتے چلاتے بھی انہوں نے "مرلیا" کا منہ چوم ہی لیا۔

غریب اور مجبور عورت کی آبرو ہی کیا۔! پھر چار دن کی بیاہی دیہاتی لڑکی تو دو حرف بھی زبان سے نہیں نکال سکتی! باقی رات مرلیا نے رو رو کر اسی سوچ میں گذار دی

ٹھری بھر بھی اس کی آنکھ نہ لگ سکی۔ فدا سی آہٹ میں ایسا معلوم ہوتا جیسے ٹھاکر کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں اور زبردستی اس کا منہ چوم لیتے ہیں۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر آج کی بات پیتم سے کہتی ہے تو نہ جانے وہ کیا خیال کرے۔ ایشور جانے اس کے خیال میری ہی طرف سے بدل جائیں یا غصے میں وہ کوئی ایسی بات کر بیٹھے جس سے زندگی بھر پچھتانا پڑے۔ پاپی کی زبردستیوں سے آبرو کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ بھوندی مرسکتا ہے تو کسی جتن ہی سے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے۔

صبح ہوتے ہوتے وہ یہی فیصلہ کرسکی کہ آج رات کی ایک بات بھی وہ پیتم سے نہ کہے گی۔

دوپہر کے قریب پیتم گھر واپس آیا۔ مرلیا کو دیکھ کر اس کے جیون میں بسنت کی طرح ہریالی آگئی۔ دو چار ہنسی مذاق کی باتیں کرکے اس نے روٹی کھائی اور ٹھاکر کے یہاں صبح کیلئے گیہوں لینے کو چلا گیا۔ کیونکہ سویرے گیہوں بونے تھے۔

انگنائی میں سفید ساڑی باندھے ہوئے رودا بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بھنڈی کی ترکاری رکھی ہوئی تھی جسے وہ کاٹ رہی تھی۔ پیتم کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

۔ صبح گیہوں بونے کیلئے .... تو لادو ۔ اس نے نیچی نگاہیں کئے ہوئے رودا سے کہا۔

۔ اور جو نہ تولوں ۔ مسکراتی ہوئی وہ بولی۔

تو پھر کون سا گھاٹا ــــــ نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ وہ بھی ہنس دیا۔

رودا ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ ۔ اچھا لے لو۔

سامنے کی سہ دری میں بکھاریاں بنی ہوئی تھیں پاس ہی بانسوں کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رودا سیڑھی پر چڑھنے لگی یتیم نے منع کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی، بانس کے ایک ایک ڈنڈے پر چڑھا۔ وہ سیڑھی کو ہلا رہی تھی اور یتیم کی طرف دیکھ کر مسکراتی جاتی!

نہ جانے سیڑھی کی کس کیل میں اس کی ساری الجھ گئی اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہی۔

یتیم نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔

میں منع کرتا تھا...... چوٹ تو نہیں لگی رودا؟ اس نے پوچھا۔ رودا نے دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں، اور اپنا سر اس کے کاندھوں پر ٹیک کر اسے بھینچ لیا اس کے روئیں روئیں سے چنگاریاں برس رہی تھیں! یتیم گھبرا گیا! وہ ڈر رہا تھا کہ آگ پھونس میں لگ چکی ہے کہیں شعلے نہ بھڑک اٹھیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ کہ چھڑانے کی کوشش کی لیکن رودا کے ہاتھوں میں بلا کی قوت آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی،

"دیکھو ہی ہو رودا — تھا کرنے اور ہمیں دونوں کو مار ڈالیں گے"

"مگر اب میں لب زندہ ہوں" اس نے جواب دیا۔

"اچھا آج نہیں...... پھر کبھی!" یتیم نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"پھر کب" رودا نے پوچھا

"کاتک پورن ماشی کو" ...... دیکھا د شیع کو!

رودا نے اس کا منہ چوم لیا ــــ "کہاں پیارے"

"یہیں چوپال میں کچھ رات گئے" یتیم کا کلیجہ دھک دھک ہو رہا تھا! نسوانی وقار کو خاک میں ملاتے ہوئے رودا کتنی بار اپنے آپ سے گر گئی

اور بمشکل ہیتم پیچھا چھڑا سکا۔

دس پانچ دن کے ہیر پھیر سے ٹھاکر کچھ رات گئے پھر ایک دن ہیتم کے یہاں پہنچ گئے! تھوڑی ہی دیر پہلے ہیتم ہل لیکر کھیت جا چکا تھا۔ مرلیا اس کے جانے کے بعد سے جاگ رہی تھی، ٹھاکر کے پاؤں کی آہٹ پہچان کر وہ چپ چاپ پلنگ کے نیچے کھڑی ہو گئی: ٹھاکر نے آتے ہی اس کا لمبا سا گھونگھٹ الٹ دیا اور ہاتھ پکڑ کر کھاٹ پر بٹھال لیا۔!

مجھ سے بھی ڈرتی ہو مرلا؟ انہوں نے کہا۔

" چاچا .... " وہ کچھ زیادہ نہ کہہ سکی! اس کا گلا بھنچ گیا۔ زور زور سے سینہ اچھلنے لگا۔

ٹھاکر نے اپنی مضبوط باہوں سے بھینچتے ہوئے کہا!

" تم کتنی سندر ہو مرلا "

مرلیا نے بہت جی کڑا کر کے اپنے چہرہ پر مسکراہٹ بلا ہی لی۔ گویا اب وہ راضی تھی۔

ٹھاکر نے ذرا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کئی مرتبہ اس کے ہاتھ دبا دیئے اور اسے کھینچکر اپنے برابر لٹا لیا!

" ٹھاکر میری لاج اب تمھارے ہاتھ ہے .... اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ " اس نے ہمت کر کے اتنا کہہ ڈالا!

" نہیں ...... نہیں مرلا! تم اطمینان رکھو! ہماری بھی تو عزت ہے۔ تم تو نچوں کی

ایک آدھ کھانا اور دس بیس روپیہ جرمانہ دے کر پھر برادری میں مل سکتی ہو مگر میں تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر کسی نے جان لیا۔ ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ہاں یہی کہتے ہیں اور بس ۔۔۔"

تو پھر آؤ ...... نا ...... !

بڑھے نے اظہار مطلب کر ہی دیا۔

مگر اتنی جلدی کیا ہے ٹھاکر ...... پھر کسی دن ۔۔۔ وہ بولی

" اور آج بھی تو وقت ہے ۔" ٹھاکر نے کہا۔

نہیں تم میرا مطلب نہیں سمجھے ۔ آج چھوڑ دو۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکنے لگی۔ ٹھاکر اس کا مطلب سمجھ گئے۔

- اچھا یہ بات ہے تو پھر کس دن ؟"

" بس پرسوں ایکادشی کے دن "

ہاں تو میری چوپال میں دس گیارہ بجے رات کو۔

ٹرلیا نے وعدہ کر لیا۔ ٹھاکر تھوڑی دیر بیٹھے رہے اور پھر اٹھکر چلے گئے۔

کاتک کی ایکادشی " ڈٹھون " کے تہوار کی وجہ سے بہت مشہور دن ہوتا ہے۔ موسمی اور فصلی تہواروں میں اس دن سنگھاڑے اور ایکھ کا نیا کیا جاتا ہے اور کئی دیوتاؤں کی پوجا چڑھائی جاتی ہے ۔ آج کی " ایکادشی " بڑی ہنگامہ خیز بن گئی تھی۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے گھر بھر میں ایسا معلوم ہوتا تو جیسے " انتظار " کے دیوتا خود آگئے ہیں۔ گھنشیام سنگھ ہیں کہ جبڑے کی کیلیں تک نکلوا دینے پر تلے ہوئے ہیں

کر رہا ہی ہے۔ سرسوں کے تیل سے اس کا سر تر بتر ہو رہا ہے۔ ٹھاکر نے سویرے اٹھتے ہی کہہ دیا کہ آج "گنگاپور" میں کتھا ہے۔ وہ کچھ دن رہے سے چلے جا ئینگے! رودا نی بتیم چمار کے آتے ہی کہا:۔

"آج ایکادشی ہے نا...... بتیم؟"

"ہاں آج تو ایکادشی ہے" بتیم نے ایسے جواب دیا جیسے وہ بھول گیا تھا۔

"کچھ یاد بھی ہے تم کو" رودا بولی!

یاد کیوں نہ ہوتا...... بتیم نے جواب دیا۔

رودا مسکرانے لگی۔ بتیم چلا گیا۔

ادھر ٹھاکر بھی دن میں کئی مرتبہ بتیم کے گھر ہو آئے تھے!

"مرلا! آج ایکادشی کا تہوار ہے نا..... مرلا۔ نہاؤ گی نہیں"!

اس نے بھی ٹھاکر کو یقین دلا دیا کہ وعدہ اسے یاد ہے!

ٹھاکر نے جیسے تیسے دن کاٹا۔ شام سے کچھ پہلے ہی کپڑے بدل کر نکل گئے۔

شائد میں سویرے آسکوں رودا۔

چراغ جلنے سے کچھ پہلے ہی ٹھاکر اپنی چوپال کی اس کوٹھری میں پہنچ گئے۔ جہاں انہوں نے آج مرلیا کو بلایا تھا۔ آہستہ سے کواڑ کھول کر اندھیرے میں پڑی ہوئی کھاٹ پر چپکے سے لیٹ رہے تاکہ پلنگ کے چرچرانے کی آواز نہ آئے۔

بار بار ان کی آنکھیں جھپک کر کھل جاتیں۔ ذرا ذرا دیر بعد ایسا معلوم ہوتا جیسے تو بعد درست مرلیا دبے پاؤں وعدہ وفا کرنے کے لئے چلی آرہی ہے! دروازہ کے قریب پہنچ گئی ہے

انگنائی میں کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی ہے ان کے کان بج رہے تھے۔ جیسے کسی نے دروازے کے پٹ کھول دیئے!...... لیکن جب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تو خالی کوٹھری میں اندھیرے کے سوا کوئی نظر نہ آتا۔ انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ سارے گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دور پر ایک آدھ کتے کے بھونکنے کی آواز ضرور آجاتی! یکایک کسی کے دھیرے دھیرے آنے کی آہٹ سے وہ چونک پڑے۔!

اندھیری کوٹھری میں ان کی تیز تیز سانسیں اس طرح آواز دے رہی تھیں جیسے سنسان جنگل میں جھینگر بول رہا ہو۔

چوں...... ؤں سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اندھیرے میں ایک خاموش سایہ...... دھیرے دھیرے...... قدم بڑھاتا ہوا تیز سانسوں کی طرف بڑھتا ہوا چلا گیا...... اور...... اور...... ایک کھلی ہوئی آغوش میں اس کا دبکا ہوا جسم!

تھوڑی سی کسمساہٹ کے بعد...... آہستہ سے کسی نے کہا!،

"پیارے...... پیتم"!

متحرک جسم دریا کے پانی کی طرح ٹھہر گئے۔

کون...... .... ؟

پہلی آواز لرز گئی...... ! بیٹا...... تم؟

جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے ایسے ہی رودا پلر پانی سے تڑپ گئی۔

دونوں چپ چاپ سر جھکائے ہوئے کوٹھری سے باہر نکل گئے۔

آسمان پر چھٹکی ہوئی چاندنی ان کے چہروں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں بیتیم حیارا ورمرلیا کے بھاگ جانے کا چرچا ہونے لگا۔ اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ بیچارہ بڑا سیدھا تھا۔
لیکن آج تک کوئی یہ نہ جان سکا کہ وہ کیوں بھاگ گئے"

جب جوانی آ رہی تھی!

ان پہاڑی سردیوں میں ...... میرے پاس کوئی بھی گرم کپڑے نہیں ہیں پپا ....
...... ؟ تمام کوٹ جمپر، پاٹنٹس سب پھٹ چکے ہیں ...... یہاں تک کہ "لانڈنگ" کے لئے ایک برجیس بھی باقی نہیں؟

پپا کے سامنے میں نے محبت بھری التجا پیش کر دی!

پپا مسکرا دیئے "بے بی! تم کتنی اچھی اور بھولی لڑکی ہو! جس نے اپنے باپ کی گاڑھی کمائی بچانے کیلئے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیا۔ اگر خدا نہ کرے بیمار ہو جاتیں تو ...... اہاسٹل کی دلچسپ سوسائٹیوں میں کھو کر ایک خط بھی نہ لکھا کہ تمہارے پاس کپڑے بھی نہیں رہے!!

"پھر میں کیا کرتی پپا" ... خط لکھتیں بے بی ...... میں روپیہ بھیج دیتا ......؟

پپا نے قہقہہ لگاتے ہوئے "پرس" نکالی، تازے تازے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے بولے! "تو آج ہی کپڑے بنا لو"

ہنستے ہوئے میں نے نوٹوں کو جھپٹ لیا ... ؟

تم کتنے اچھے ہو میرے پپا"

ان کی آنکھوں میں مجھے خوش دیکھ کر مسرت کے آنسو چھلک آئے، اور

"شب بخیر" کہتے ہوئے وہ ہاسٹل کے ملاقاتی کمرے سے باہر نکل گئے۔

"مامی" کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ میری عمر دس برس سے کچھ زیادہ ہی تھی جب مجھے ڈیرہ دون بھیجدیا گیا؟ یہاں ہاسٹل اور کالج کی زندگی نے مجھے اپنا لیا تھا ——! سورج نکلنے سے پہلے اٹھنا، نہانا دھونا۔ لطیفہ، مس جیمس، "روزی اور کملا" کے دل فریب جھرمٹ میں "واکنگ" کرنا۔ ناشتہ اور پھر لکھنا پڑھنا؛ پھر کالج، سہ پہر کو کھیل کود کبھی کبھی شام کو پکچر! یہی میری زندگی کا یادگار پروگرام تھا چھٹے چھ ماسہ پپا آتے اور مجھے اپنی مسرور آنکھوں سے خوش و خرم دیکھکر واپس جاتے! کیونکہ ان کو چھٹی نہیں ملتی تھی وہ اسی صوبہ میں جیل سپرنٹنڈنٹ تھے! میرا دنیا میں ان کے اور "سہیل" کے سوا کوئی بھی نہ تھا! سہیل میرے ماموں کا لڑکا تھا۔ انگلستان میں کئی برس سے بیرسٹری کی ڈگری کیلئے باپ دادا کی جمع کی ہوئی گاڑھی کمائی بیدردی سے اڑا رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ مرتے وقت "مامی" پپا سے کہہ گئی تھیں کہ میری اکلوتی بچی کا ناتہ سہیل سے جوڑ دینا۔

میں نے ان کو بہت دن ہوئے دیکھا تھا جب میں بہت چھوٹی تھی اور وہ ایچے خاصے ہو گئے؟ انہوں نے مجھے محبت سے گلے لگا کر چوم لیا تھا اور بس۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

ہوسٹل کی زندگی میرے لئے روز بروز دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میری سہیلیوں میں لطیفہ بڑی متین اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ، قدرتی مناظر کے مشاہدے، یا تصویر کشی میں گذرتا۔ وہ اکثر بہت کم بات چیت کرتی تھی! اس کے برعکس روزی اور کملا بڑی شریر اور ملّی لڑکیاں تھیں۔ یہ دونوں مجھ سے سن میں بڑی تھیں لیکن آپس میں بالکل برابر۔ "مس جیمس" کتنی اچھی تھیں، اب بھی

جب یاد کرتی ہوں تو ان کی بوڑھی جوانی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے! اس کی فطرت میں بزرگی، محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کمبخت روزی اگر کہتی۔ "دیدی" اگر تو کسی گرجا کی پوپ بنادی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ شریر کملانے تو "بوڑھی ملانی" اس کا نام ہی رکھدیا تھا۔ اور منیکر وہ ان سب کی دلچسپیوں میں دل بڑھا دیتی! سارے ہوسٹل بھر میں مجھے نفرت تھی تو اس کمبخت بوڑھی "لیڈی ڈاکٹر" سے! جس نے مس کراؤن جیسی شریف لڑکی کو ایک ذرا سے پیٹ میں درد ہونے پر نہ جانے کیا رپورٹ کر کے ہاسٹل سے نکلوا دیا تھا۔ یہ نفرت بیٹی اینگلو انڈین بڑھیا دسویں پندرھویں نہیں تو مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور سب لڑکیوں کا "میڈیکل ٹیسٹ" لیتی۔ "بلیک روم" میں لیجا کر ایک ایک لڑکی کی جسمانی ساخت اور خدا جانے کن کن چیزوں کو دیکھتی۔ میں اور میری ہمسن لڑکیاں چونکہ بہت چھوٹی تھیں۔ اس لئے ان کے ساتھ "بلیک روم" والا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ مگر پھر بھی ہم لوگوں کو اس طرح ٹٹولا جاتا تھا جیسے "منڈی" کیلئے ویٹرنری ڈاکٹر ان جانوروں کو ٹٹولتا ہے جو ذبح کئے جانے کیلئے چنے جاتے ہیں۔

"میڈیکل ٹسٹ" کیلئے جب ہم سب جمع تھے تو "بلیک روم" سے میرا نمبر پکارا گیا! میں سمجھی کہ دھوکے میں غلط نمبر پکار لیا گیا ہے!

دوبارہ پھر نمبر "۳۴" میں اب بھی نہ گئی۔

پھر آواز آئی، "مس شہناز رحمان" اب تو یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میرا ہی نمبر! میرا ہی نام۔ یا اللہ کیا معاملہ ہے۔

اندر چلی گئی ——!

وہی اینگلو انڈین لیڈی ڈاکٹر —— بیٹھی تھی جس سے مجھے اللہ واسطے کا

بہر تھا ——!

موٹے موٹے...... شیشوں کی عینک سے جھانک کر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی :-

" دیکھو —— مس رحمان...... اب تم جوان ہو رہی ہو!..... اور...... تم کو چاہیئے کہ...... اپنی خوبصورتی اور جوانی کی حفاظت کرو! اس نے رکتے ہوئے کہا۔
"تم کو چاہیئے ، اپنے خیالات ، اور رجحانات صرف اپنی تعلیم اور صحت کی طرف بدل دو —— خوبصورتی اور جوانی صرف نیک چلنی اور خوش سیرتی سے مل سکتی ہے —— ؟ تم کو چاہیئے ......؟"

میری آنکھیں بالکل زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور میں —— اچانک محسوس کر رہی تھی —— کہ جوانی آ رہی ہے !..... لیکن...... لیکن...... کیا مجھ میں اس بوڑھی نفرت کرنیوالی لیڈی ڈاکٹر نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو اس کو نیک چلنی کی ہدایت کرنا پڑی مجھے! نہیں...... نہیں...... ضرور اس سے میرے خلاف جھوٹی باتیں کہی گئی ہیں...... ورنہ وہ یہ لکچر کاہیکو دیتی ؟

زندگی میں پہلی مرتبہ سچ مچ میرے دل کو ٹھیس لگی! میرا دل بھر آیا.... نفرت اور غصہ سے بدن کا رؤیاں رؤیاں کانپ اٹھا۔ میرا سر...... چکرانے لگا...... آہ...... اگر آج میری "مامی" مجھکو اس دنیا میں بالکل تنہا چھوڑ کر نہ چلی جاتیں تو یہ سب کچھ کاہے کو سننا پڑتا۔ آہ...... میرا دل اس منحوس ہاسٹل کی پُر فریب...... اور بہت دلچسپ دنیا سے نفرت کرنے لگا۔ میں کانپ رہی تھی۔

بڑھیا نے کہا! لیٹ جاؤ میز پر!

میں اس کی ہیبت سے سہمی ہوئی چپ چاپ سامنے والی میز پر لیٹ گئی۔
کرسی سے اٹھکر بوڑھی میم میز کے کنارے...... میرے منہ کے پاس آگئی۔
انہیں موٹے موٹے شیشوں کی عینک سے جھانک کر اس نے کہا۔ ؟ " آنکھیں کھولی رہو ــــــ!"
میں نے ڈر کر آنکھیں کھولدیں پھر خود بخود نہ جانے کیوں آنکھیں جھک گئیں!۔
پپوٹوں کو زبردستی کھولتے ہوئے بولی وہ ــــــ!
پتلیاں پھراؤ۔
میری پتلیاں نیچے جھک گئیں...... ان میں کوئی گردش نہ ہو سکی۔
اس نے جھلا کر آنکھیں چھوڑدیں۔ دل کی طرف بڑھی۔ جمپر کو ہٹاتے ہوئے "اسٹھسکوپ" لگادیا۔
" زور سے سانس لو...... نیچی سانس ...... اور زور سے ...... پھر نیچی سانس!"
میں کوئی بھی سانس نہ لے سکی۔ دل ضرور دھڑکنے لگا!
ساری کا پلو ہٹاکر...... اس نے جمپر کے "فاؤنٹین" کھولدیئے۔
سینے پر کوئی پردہ نہ تھا۔
میں نے بے اختیاری میں کروٹ لے لی۔ "سیدھی لیٹو! سیدھی! ابھی" اس نے زبردستی سیدھا کرتے ہوئے کہا!۔
سینے کو کئی جگہ سے دباتی ہوئی بولی! دونوں ہاتھ اونچے کردیا! بغلوں کی ملایم جلد کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے ٹٹولا۔ مجھے گدگدی سی لگنے لگی...... ہاتھ پھر نیچے ہو گئے۔

پیٹ، پسلیاں ...... رانیں اور جسم کے مختلف حساس اعضاء کے ساتھ "طبِ جدید" کا یہی مظاہرہ کیا گیا۔ میں بری طرح بھڑک گئی۔ سارا جسم پسینے پسینے ہوگیا۔

"جاؤ" نمبر ۳۴

میں بلیک روم سے باہر نکل آئی ......!

آج کالج میں چھٹی تھی۔ سب لڑکیاں "شاپنگ" کیلئے بازار جارہی تھیں۔ مس جیمس اور روزی نے مجھے بھی لیجانا چاہا۔ میں بھی جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ بہت سا کپڑا خریدنا تھا لیکن نہ گئی۔ ...... سر میں کچھ میٹھا میٹھا سا درد ہو رہا تھا ...... اور رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیالات امنڈ رہے تھے کہ "میں اب جوان ہورہی ہوں" "جوانی آرہی ہے جوانی" اندر سے اپنا کمرہ بند کر کے چپ چاپ مسہری پر لیٹ رہی۔ کئی بار کتابوں سے دل بہلانا چاہا مگر کچھ نہ پڑھ سکی! ...... کسی بات میں آج دل ہی نہ لگتا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ بار بار یہی سوچتی تھی کہ ...... جوانی آرہی ہے! جوانی"

"جوانی کیا ہوتی ہے"؟ مجھکو کچھ بھی معلوم نہ تھا صرف اتنا یاد ہے کہ میری بڑھی اماں میری شرارتوں پر ڈانٹ کر اکثر کہا کرتی تھی کہ "بے بی شرارت نہ کرو ورنہ جوانی آجائیگی" اس وقت میں سمجھتی تھی کہ جوانی کوئی مہیب قسم کی ڈراؤنی چیز ہوگی جو شریر وشوخ بچوں کو ان کی شرارت پر سزا دیتی ہوگی ...... پہلے مجھے جوانی سے اتنا ہی ڈر لگتا تھا جتنا میں لنگوری بندر ...... اور کالی بلّی سے ڈرتی تھی۔ یہ کمبخت لنگوری میرے ہاتھ سے ایک دن پیسٹری چھین کر لیگیا تھا ......، یہ موئی کالی بلّی ......، تو میرے سامنے چائے کی میز پر رکھے ہوئے دودھ دان کا سارا دودھ چٹ کر گئی تھی ...... مگر

...... مگر ... آج نہ جانے کیوں مجھے جوانی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ خدا معلوم میرے دل میں ؟ آج جوانی کے کیا معنی تھے میں خود بیان نہیں کر سکتی ــــ ! میں خیالات کے ہجوم سے گھبرا گئی سینے کی طرف دیکھا ...... دھڑک رہا تھا .... ابھی تک میں وہی ساری پہنے ہوئے تھی جس کو اس بوڑھی لیڈی ڈاکٹر نے چھو لیا تھا ...... اٹھ کھڑی ہوئی ...... اس ساری کو نہ پہنوں گی اب ! الماری سے دوسرا جمپر اور دوسری ساری نکالی۔ ...... سنگار میز کے پاس جاکر جمپر اتار دی جمپر جو اس موئی بڑھیا نے چھوا تھا ...... جیسے اس جمپر سے بھی نفرت ہونے لگی ...... مجھے یاد آگیا .... اس نے میرے سینے کو بھی چھوا تھا .... دل میں آیا ...... غصہ میں کئی مرتبہ اس بوڑھی لیڈی ڈاکٹر سے کہیں زیادہ بدسلوکی کی .... اپنے سینہ کے ساتھ ..... جو سرخ ہو گیا تھا ہاتھوں کو اٹھایا ..... مگر نگاہیں نہ اٹھ سکیں ...... بغلوں کی طرف !!

جلدی جلدی ساری بدل کر میں مسہری پر لیٹ کر پڑ رہی ..... پھر سنہ کھول دیا ...... کتنی الجھن تھی آج ــــ ؟ "کیا سچ مچ جوانی آرہی ہے " کروٹیں بدلتے بدلتے آنکھیں بند ہو گئیں ...... میں نے دیکھا ...... جوانی آرہی تھی ...... ایک بہت بڑی دریا کے کنارہ میں لطیفہ، روزی، حسن جمیس اور کملا ٹہل رہے ہیں۔ یکایک بڑی خوفناک آوازیں آنے لگیں ! روزی اور کملا وغیرہ بھاگیں ... سیلاب ہے ...... سیلاب ...... بھاگو ...... میں سکتے میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ دیکھوں سیلاب کیسے آتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی دوڑتی ہوئی لہریں پاؤں کے نیچے آگئیں ...... گھبرا کر چونک پڑی۔ کتنا ڈراؤنا خواب تھا بھیانک ! دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کچھ ہلکا ہلکا سا ٹمپریچر ... اور سر میں درد بھی تھا ـــــ مسہری سے اٹھ کر میں نے اسپرو

کی گولیاں حلق سے اتار لیں...... کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا...... لطیفہ تھی؟

"کیسی ہو شہنا"، اس نے پوچھا — !

"کچھ ٹمپریچر اور ہلکا سا درد ہے سر میں —" ! میں نے اِستقبال کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ.... تب تو تم ذرا لیڈی ڈاکٹر..... کو دکھلاؤ .... آج کل موسم اچھا نہیں ہے۔ میں لیڈی ڈاکٹر کو کہتی ہوں ابھی —" !

"نہیں .... نہیں ..... لطیفہ بہن..... میں بالکل اچھی ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے"!

"یہ تمہاری کون سی ضد ہے۔ بیماریوں میں ایسی ضد اچھی نہیں ہوتی" — لطیفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر میں تو بالکل اچھی ہوں...... اب ! اسپرو کی گولیاں کھائی ہیں...... آؤ چل کر تھوڑی سی چائے پی لیں بس"

اتنے میں قہقہوں کا طوفان اٹھاتی ہوئی روزی، کملا اور مسز جیمس آگئیں۔ بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی تھی۔ سب چائے پینے کیلئے چلدیں۔

چائے پر مسز روزی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کہو شہنا۔ میڈیکل ٹیسٹ کیسا رہا تمہارا —" ؟

کملا نے دخل درمعقولات کرتے ہوئے کہا۔

"ویسا ہی جیسا تمہارا سب کا رہ چکا ہے" ۔

لطیفہ نے پیسٹری کے ٹکڑے کو جھنجھوڑتے ہوئے راز کھول دیا۔

"لیکن ہم کو تو بخار نہیں آیا تھا۔"

میں جھینپ گئی۔ سب لڑکیاں جھپٹ گیئں۔ کیوں! کیا ہوا شہنا؟ کیسی ہو

کس وقت بخار آیا ..... کون سی دوا دی تم کو لیڈی ڈاکٹر نے .... اوہ ..... تمہارا

ماتھا اب تک جل رہا ہے۔ ہزار ہا اور مسلسل سوالات نے میرے حواس کھو دیئے۔

سب لڑکیوں نے نہ جانے اشاروں ہی اشاروں میں کیا بات چیت کر لی۔

رفدی نے لیڈری کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا ——— ! تو پھر اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم

سب کا ایک ڈنر .... تم پر واجب ہو گیا شہنا!

میں نے پوچھا ...... کیوں ......!

وہ کہنے لگی ... میڈیکل ٹیسٹ، میں جو لڑکیاں ہر طرح پوری اترتی ہیں ان

سے ڈنر لیا ہی جاتا ہے۔ "اچھا تو ہو گا ڈنر"

روزی کی ہاں میں ہاں ملانے والی لڑکیوں نے ہلڑ مچا دیا۔ پاس پڑوس سے اور

بھی لڑکیاں آگیئں ——— اور بالاتفاق رائے، "ڈنر" کا دن مقرر کر دیا گیا ..... اگلا اتوار

کالجوں اور سکولوں میں سوسائٹی کا ڈسپلن ہی بڑی چیز سمجھا جاتا ہے! اور باری

باری ہر ایک کو بیوقوف بننے کیلئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے ...... چنانچہ میں بھی بیوقوف

بنائی گئی اور بننا پڑا ———!

کھیل کود کا وقت آچکا تھا ...... سب لڑکیاں سبزہ زار پر پہنچ گیئں تھیں۔

روزی اور کملا نے بہتیرا چاہا کہ مجھے بھی کھینچ لے جائیں لیکن میں نے عذر کر دیا کہ میرا جی نہیں

لگتا ——— اور اپنے کمرہ میں چلی آئی۔

کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے سنگھار میز کے سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گئی ———

بڑی دیر تک آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن آنکھیں چار نہ ہو سکیں...... آج میری نگاہوں میں کچھ عجیب سی کی شرم اور نئے انداز کی حیا پیدا ہو گئی تھی۔ کئی بار کنگھا اٹھا کر میں نے الجھی ہوئی لٹوں کو درست کرنا چاہا...... مگر...... کچھ بھی نہ کر سکی!

آج میں نے اپنے جسم کو کئی مرتبہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن شرم...... نجانے کہاں کی شرم مجھ پر ٹوٹ پڑی تھی۔

غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر گئی...... سوکھے ہوئے ٹب پر ترس آگیا۔ میں دن میں کتنی بار نہاتی تھی۔ سیکڑوں مرتبہ۔ سوچ رہی تھی۔ جی میں آیا۔ لاؤ نہا ڈالوں۔ شاید اسی طرح کچھ ہلکا ہو جائے جی۔ ٹب میں پانی بھرنے کے لئے نل کو میں نے کھول دیا نہانے کے کپڑے میں نے پہن لئے تھے!

تب تھوڑی دیر بعد ٹب بھر گیا۔ جیسے ہی میں نے اس میں قدم رکھا ہے خواب والا سیلاب یاد آگیا۔ بدن میں خوف و ہراس کی جھرجھری پیدا ہو گئی۔ جیسے دریا کا پانی میرے پاؤں کے نیچے آگیا۔

صابن کی جھاگ سے ہوا ٹب ہمالیہ کی چوٹی کی طرح سفید نظر آرہا تھا اور اس برفانی چوٹی سے صرف میرا ابھرا ہوا سر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم کے ان حصوں کو دیکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جو اس منحوس لیڈی ڈاکٹر نے چھو لئے تھے۔

نہانے سے میرا تمام جسم پاک ہو گیا تھا۔ اور میں اتنا خوش تھی جیسے گنگا سے نہا کر ایک۔ جاتری۔ خوش اور مسرور ہوتا ہے۔

کہاں سے کہاں!

بھرپور بدن کا نازک نازک مورتی اور حسین مجسمہ! مخمور گلابی آنکھوں میں حجاب آگیں جوانی کی توبہ شکن انگڑائیاں! کتنی خوبصورت اور شکیل ہوگی لڑکی! مس شمسہ جمیل بلا کی ذہین، قیامت کی طباع، شوخ و طرار، لکھتی ہے تو الفاظ کی گنگا جمنا بہاتی چلی جاتی سوچتی ہے تو فردوس اور ناہید کی تخیلی دنیا سے کوسوں دور نکل جاتی ہے۔ محاورات اور روز مرہ جیسے لال قلعے کی ٹکسالی زبان! کتنی خیالی جنتیں اس کے نسخے سے دماغ میں رقصاں جنبیاں ہیں۔

"محبت" کتنا عجیب و غریب نظریہ پیش کرتی ہے محبت کے متعلق یہ لڑکی!
— کیا سچ مچ محبت فریب نفس کا ایک خوبصورت اور رنگین نام ہے "مرد" عورت کی جمالیاتی کائنات پر ڈاکہ ڈالنے کیلئے، اس کے حسن و شباب پر قبضہ کرنے کیلئے، محبت کا فریب دیتا ہے عشق کا ڈھکوسلا بناتا ہے! کیا واقعی اس جمیل ادیبہ نے اپنے تازہ ترین شاہکار "ناہیدہ" میں اپنے دل کی چھپی ہوئی گہرائیوں کو نقش بر آب نہیں کر دیا۔

- "ناہیدہ" اپنی کائنات دوشیزگی کو...... مرد کی ابا بہیمیوں اور رنگینیوں کی نذر کر دینے سے پہلے اپنے ڈوبتے ہوئے سفینے کو طوفانی موجوں میں غرق دیکھتے ہوئے مسکرانا چاہتی تھی! وہ سچ مچ ناہید تھی۔ عصمت، عفت، دوشیزگی اور وقار نسوانیت

جیسے چمکتے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں اپنی زندگی کو وہ ایک مکمل اور کامیاب زندگی دیکھنا چاہتی تھی ، اس کے نزدیک عورت اس "سماجی مرد" کی آغوش میں ہی جسے شوہر کہتے ہیں اگر جذبات اور ہوس کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ مکمل عورت نہیں رہتی ۔

شمسہ کے متعلق کتنی تخیلی تصویریں میرے ذہن کے گوشے گوشے میں جگمگانی لگیں ۔ یہ کمسن ادیبہ بڑی ہو کر کتنی لافانی شہرت اور عزت حاصل کرے گی ۔ ادب اور افسانے کی دنیا میں کتنے جادوانی نقوش کبھی نہ مٹنے والے پاکیزہ نظریئے پیش کرے گی ۔ مگر آہ .... دوشیزگی کی نوجوان حسرتوں میں ! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے چھپے ہوئے دل میں انسانیت اور سماج کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں بھڑک رہی ہیں ۔ وہ مرنا چاہتی ہے ! ایسے ارادہ کے ساتھ جو عورت کا ارادہ ، دوشیزگی کا عزم ، اور عصمت کی ہٹ ہے ۔ کنواری لڑکی خدا کیلئے دنیا کی حسرتوں کو پامال نہ کر ، سوچ اور سوچ ، تیری تحریریں ، تیرے خطرناک ارادوں کی کتنی آئینہ دار ہیں ، میں دیر تک سوچتا رہا ۔

رسالہ "خیال" کے ماہانہ شمارے میں "شمسہ" کے انقلاب انگیز افسانے پڑھتے پڑھتے اس ننھی ادیبہ کے متعلق ہزار ہا رنگین تصورات میرے دل و دماغ پر چھا چکے تھے ۔ کتنی خیالی تصویریں ، کتنے تصوراتی سراپے ! میں نے بنا ڈالے تھے ۔ اس لڑکی کے متعلق ! جس سے اردو ادب اور افسانہ نگاری بہت سے گراں مایہ نظریئے حاصل کرنے کیلئے بیتاب تھا ۔ جس کی تحریریں موجودہ دور میں ایک ایسا لافانی شاہکار خلق کر رہی تھیں جو ابد الآباد تک زندہ رہنا چاہتا تھا ۔ اے کاش جو کچھ وہ لکھتی ہے ، وہ اس کے سچے جذبات دلی احساسات اور ذاتی نظریئے نہوں ! خدا کرے ...... یہ سب کچھ افسانہ ہو اور خود

اس کی زندگی اس افسانوی تمثیل سے کوسوں دور، محض ایک دوشیزہ کی پر ارمان، پر اضطراب اور بیقرار زندگی ہو! اس کا دل معصوم دل تڑپ رہا ہو، اس کبھی نہ مٹنے والی خلش کیلئے جو ایک الھڑ اور معصوم لڑکی کے دل کو بے چین کر دیتی ہے۔

اے ننھی ادیبہ! تجھے کیا معلوم کہ تیرے ان ادبی شاہکاروں پر جان دینے والے، کتنے شاعر اور ملک کے کتنے اہل کمال ہیں جو تیری ذراسی جنبش چشم و ابرو پر اپنا سب کچھ نثار و قربان کر دینے کیلئے تیار ہیں، میرے دل میں بھی اشتیاق اور تمناؤں کا سمندر موجیں مارنے لگا، دل کی بے اختیارانہ کشش کہنے لگی کہ تیری لافانی محبت کو شمسہ ضرور لبیک کہہ گی، لیکن ایک نادیدہ عاشق ایک دوشیزہ کو اس طرح محبت کا پیغام کیسے دے سکتا ہے۔ عورت، عورت کے دل کا راز جان سکتی ہے: میں نے ایک فرضی سہیلی کا روپ بھر کر اسے لکھا۔

میری پیاری شمسہ، تسلیمات!

آپ کے افسانے ماہنامہ "خیال" میں پڑھتی رہتی ہوں! کیا "محبت" کے متعلق آپ نے جتنے نظریئے ان افسانوں میں پیش کئے ہیں وہ آپ کے ذاتی خیالات ہیں! میری اس بیباکانہ جسارت کو معاف فرمایئے گا میں اس سلسلہ میں یا تو آپ کی ہم خیال بن جاؤں گی یا آپ کو اپنا ہم خیال بنالوں گی۔

کیا آپ اپنی ایک ہمراز سہیلی سمجھ کر مجھ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کرنا پسند کرینگی۔

آپ کی بہن
"رفعت" احسان علی از بنارس

ہفتہ بھر کے بعد ہی مجھے شمسہ کا ایک لفافہ ملا۔

میری پیاری بہن نعمت !

آداب ، آپ کا خط ملا ۔ میرے افسانوں میں آپ نے جو کچھ پڑھا ہے وہ میرے سچے خیالات اور ذاتی تاثرات ہیں محض افسانوں کی رنگ آمیزی کے لئے اپنے صحیح نصب العین اور ذاتی خیالات سے ہٹ جانا میں پرلے درجہ کی " ادب فریبی " اور ادب کیسا تھ انتہائی بے ادبی سمجھتی ہوں ! مرد ایسے سماجی اور فطری فریب کو میں ہمیشہ فریب سمجھتی رہی اور سمجھتی ہوں ۔ میں نے خود شادی سے انکار کر دیا ہے ۔ اگر آپ اس سماجی دھوکہ میں نہ آچکی ہوں تو خدا کیلئے فوراً انکار کر دیجئے ۔ سوسائٹی و سماج کا ہمت کیساتھ اسی وقت مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔ جب ہم آپ جرأت و پامردی کے ساتھ اس کے ڈھکوسلوں کو توڑ دیں ۔ یہی نہیں بلکہ مرد کو دنیا کے دائرہ انسانیت سے اس طرح خارج کر دیں ۔ جس طرح اس بزمِ موجودات میں کبھی اسکا وجود ہی نہ تھا۔

یہ سچ ہے ایسی صورت میں دنیا کی تخلیق ضرور ختم ہو جائیگی ۔ لیکن بہر حال یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہے ۔ دنیا آج نہیں تو کل ختم ہی ہو کر رہے گی ۔ فطرت مرد سے عورت کی مظلومیت کا انتقام لے گی اور لے کر رہے گی ۔ پر ہم اس سلسلہ میں اس کا ہاتھ کیوں نہ بٹائیں ۔ میں وقار نسوانیت کو قائم رکھنے کیلئے عصمت اور عفت کو سماج کی آندھیوں سے بچانے کیلئے نہ محض خود بلکہ ساری دنیا کو تباہ و برباد دیکھنے کیلئے بیقرار ہوں ۔ کاش آپ بھی میری ہم خیال بن سکیں ......؟

آپ کی

" شمسہ "

خط پڑھتے ہی میری بیقراریوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اب کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ تھی۔ افسوس، ننھی ادیبہ، معصوم لڑکی نے جو کچھ لکھا تھا حقیقتاً وہ اس کے ذاتی تاثرات اور ادبی نتائج تھے۔ تعجب تو اس بات کا تھا کم سن لڑکی ـــــ جو ابھی ایک معصوم اور بن کھلی کلی تھی اس نوجوانی اور کمسنی پر شادی سے انکار ہی نہیں تنفر کا اظہار کر رہی تھی۔

شمسہ کے انکار نے میرے دل کی بیقراریوں میں اور بھی آگ لگا دی۔ میں ان دیکھی اس کا نادیدہ عاشق تو ہو ہی چکا تھا اشتیاق اور اضطراب نے بے چینیوں میں ایک ایسا اضافہ کر دیا اشمسہ کی خیالی تصویر درد سراپا بن گئی۔ دل اس کو اپنا لینے کیلئے اس طرح تڑپنے لگا جیسے دریا کے کنارے ریت میں تڑپتی ہوئی مچھلی پانی میں سما جانے کیلئے بیقرار ہو ـــ!

آپ جانتے ہیں جب محبت کا بھکاری کسی کے در سے ٹھکرا دیا جاتا ہے جب محبت کی تکمیل میں انکار کی چٹان سنگ راہ ہو جاتی ہے تو انسان کتنا پاگل، کتنا دیوانہ اور خبطی ہو جاتا ہے۔ محبت انتظار اور وعدوں پر کتنا زندہ رہ سکتی ہے۔ ہزار ہا برس لکھو کھا سال، اگر صرف محبت کی تسکین جھوٹے وعدوں سے کر دی جائے تو ہجر و فراق کی لذتیں صدیوں کیلئے انسانوں کو زندگی بخش سکتی ہیں، انسان امید دل پر مر جانے کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن ـــ نا سمجھ شمسہ نے میرے چوٹ کھائے ہوئے دل پر انکار کا نشتر چلا کر کے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا، میری تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔ اے کاش! وہ سمجھ سکتی کہ پھول اسی لئے ہوتے ہیں کہ جوڑا اس سے دلہن بنے، شمعیں جلتی ہیں اور اسی لئے کہ پروانوں کی پیاس بجھا سکیں چاند چکور کیلئے جگمگاتا ہے اور

انسان محبت کیلئے پیدا ہوا ہے ، میں نے اس کے خط کا جواب لکھ کر بھیج دیا۔

پیاری شمسہ ! تسلیم !

محبت نامہ پہنچا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تم نے میرے خط کے جواب میں اپنے کسی نئے افسانے کا کوئی حصہ نقل کر دیا ہے ۔ میری پیاری بہن ! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تم نے افسانوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ افسانہ ہی ہوگا اور میں تم کو بہت جلد اپنی " بھابی " بنانے میں کامیاب ہو جاؤنگی ۔

لیکن اب شائد تم کو رام کرنے میں کچھ دیر لگے گی ، سماج اور سوسائٹی کے بندھن توڑ ڈالو اور رسومِ جہالت کا خاتمہ کر دو ۔ مگر خدا کیلئے نظامِ قدرت اور فطرت کی آہنی دیواروں سے نہ ٹکراؤ ۔

میری اور تمہاری جیسی کروڑوں عورتیں خود کو فنا کر کے قدرت کے اصولوں کو نہیں توڑ سکتیں ۔ سماج ہماری کمزوریوں کا نام ہے ، اور مرد صرف " ایک ماں کا بچہ " دنیا کی کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ مرد تنہا نظامِ عالم کو سلجھا لینے پر قادر رہا ہو ! مرد اور عورت جسمِ انسانیت کی دو روشن آنکھیں ہیں اور ایک آنکھ کے بغیر یہ مجسمہ بیکار ہے !

شادی تو ابھی میری بھی نہیں ہوئی ہے لیکن اس وقت تک سچ مچ میں شادی نہیں کروں گی جب تک تمہیں اپنی " بھابی " بنا کر اپنے گھر نہ لے آؤنگی ۔۔۔ !

تمہاری

" رفعت "

میں سمجھتا تھا کہ ضدی لڑکی جھنجلا کر میرا خط پھینک دے گی اور ہرگز کوئی جواب نہ

دے گی۔ میں اپنا بھائی بن کر خود اپنی شادی طے کرنے کیلئے اس کافر کو رام کرنے پر تُلا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح اس باغی ادیبہ کے سر سے بغاوت کا جنون کردوں۔ محبت کے بے پناہ انتظار میں پندرہ بیس روز کے بعد دفعتاً شمسہ کا خط آہی گیا۔ لکھا تھا۔

بہن رفعت!

آداب عرض کرتی ہوں خط پہنچا شکریہ! اس طرف میں کچھ بیمار ہو گئی تھی اس لئے جواب نہ دے سکی امید ہے کہ معاف کردو گی تعجب ہے کہ تم نے میری۔ تحریک بغاوت۔ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے دل ودماغ پر تہذیب قدیم کی روایات جیل کا تسلط ہے، میں کہتی ہوں محبت تو محبت! اس خود غرض انسان کو انسانیت سے بھی دور کا علاقہ نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ اگر ہمارے بزرگ کوئی غلطی کر چکے ہوں تو ہم بھی اس غلطی کو ضرور دُہرائیں۔

عورت و مرد کے جنسی تعلقات دراصل فطرت کی مجبور تعلیم نہیں ہیں! مسیحی کلیساؤں میں رہنے والی سیکڑوں عورتیں آج رہبانیت اور تجرد کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور اُن کی روحانیت، صحت، اور انسانیت نہ محض مایل بہ ترقی ہے بلکہ یہ قابلِ رشک زندگیاں کامیابی کے قدم چوم چکی ہیں۔

پیاری بہن! پھول اتنی ہی دیر خوبصورت اور مشکبار رہتا ہے جب تک شاخِ گل کی زینت رہ کر تتلیوں اور بھونروں کے نرم و سخت پنجوں کی گرفت سے محفوظ و مامون رہے، عورت بھی ایک خوبصورت پھول ہے جس کی جوانی، خوبصورتی، اور عصمت سے کھیلا نہیں جاسکتا۔ خدا کرے تم کسی کی بھابی بن سکو ورنہ میں۔۔۔

تمہاری شمسہ۔

شوخ و طرار ادیبہ کے اس بیباکانہ جواب نے رہی سہی آس بھی توڑ دی! یہ تو ممکن تھا اور تھا بھی ایسا ہی کہ میں کسی کی "بھابی" نہ بنوں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شمسہ "رفعت" کی بھابی بن کر میرے دل کی دنیا کو آباد نہ کرے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ساعت بھی کتنی دلچسپ گھڑی ہو گی جب میں شمسہ کے معصوم دل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جیت لوں گا۔ اس کے باغیانہ فلسفہ کو ہم باطل ثابت کر کے اس کی دلکش جوانی، نظر فریب اداؤں اور خشک فلسفہ میں الجھی ہوئی عطر بیز گنھیری زلفوں کے پرخم اپنے شانوں پر لہراتے ہوئے دیکھوں گا اور وہ محسوس کرے گی کہ زندگی، فلسفے، نظریہ اور دوسروں کے تاثرات کا نام نہیں ہے! حقیقی زندگی پُرکیف ارمانوں اور غم فراموش تمناؤں میں مل سکتی ہے۔۔۔۔ یہاں تک کہ شمسہ مجبور ہو جائے گی اور........ اور...... کھلکھلا کر ہنس دے گی کہ میں نے اپنے افسانوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ محض افسانوی فلسفہ تھا کیا تم کو ان کی صداقت پر سچ مچ یقین آ گیا تھا...... کبھی...... کبھی...... کبھی!

اسی انکار و اضطرار کے ہنگام میں کروٹیں بدلتے ہوئے میں نے شمسہ کے خط کا جواب لکھ دیا۔

میری پیاری بھابی، "شمسہ"!

خدا کیلئے مجھے معاف کر دینا تمہارے فلسفہ کا جواب آج میں گستاخیوں سے دے رہی ہوں! اس لئے نہیں کہ لاجواب ہو کر تمہارے سامنے مجبور ہو گئی بلکہ اس لئے کہ تم میں سچ مچ میری بھابی بننے کی صلاحیت موجود ہے! میرے بھائی جان بھی تمہارے ہی جیسے سرپھرے ادیب ہیں! سماج سوسائٹی رسم و رواج ان سب کے قائل نہیں ہیں

جیسی وہ خود ہے ..... ہاں ہاں ایک آدھ میری ہچکیاں ضرور ہو گی کوئی، اور وہ مجبور کرے گی ہنسائے گی، سمجھائے گی، شاید ممکن ہے اس کی نوجوان تمناؤں میں کوئی ایسی لہر آجائے جس سے میرے دل کے نغموں کا ساز اس کے دل کی گہرائیوں میں وجد کرنے لگے اور وہ اپنی آرزوؤں بھری جوانی کی خودکشی سے باز آجائے۔

سچی محبت دراصل کافرسی کا ذحسینہ کے دل کے گہرائیوں میں بھی اپنا گھر کر لیتی ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو، ہجر و فراق کی آتشِ فروزاں مجھے خاکِ سیاہ کر رہی ہو اور میرے گھر کو تباہ کر دینے والے چین کی نیند سو رہے ہوں!

اے ننھی ادیبہ۔ باغی لڑکی! اگر یہ پہاڑ جیسی راتیں میں نے رو رو کر گزاری ہیں تو بھی کیا ..... تیرے دل میں بھی یقیناً ایک ایسی دردآفریں خلش پیدا ہو گی ہے جو تجھے بھی چین نہ لینے دیتی ہو گی جتنے دن گزرے میں نے تیری ان دیکھی صورت کے بنائے ہوئے تصورات تیری آنکھوں میں ہی مچل رہے ہوں گے میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے افسانوں کے فلسفوں میں کتنی نرماہٹ، نظریوں میں کتنی ملائمیت، تحریروں میں کتنا سوز و گداز، اندازِ بیان میں کتنی دھڑکن، الجھن، خلش، اور اضطراب پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ فطرت سے بغاوت کا طوفانی جذبہ کتنا سرد ہوتا معلوم ہو رہا ہے اب، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تو جو کچھ لکھ رہی ہے وہ صرف افسانہ ہی ہے۔ میں کتنا خوش نصیب اور قسمت والا ہوں کہ میرے جذبۂ دل کا تیر خطا نہ کر سکا ہمالیہ کے پتھر کی چٹان کو میرے جذبۂ دل نے موم کی طرح ملائم بنا دیا ہے۔

اے حسینہ! اگر تو نے میرے کئی خطوط کا جواب نہیں دیا تو کیا ---- میں تجھ کو

لکھتا رہوں گا۔ برابر لکھتا رہوں گا یہاں تک تجھے خطوط لکھوں گا کہ ایک دن مجبور ہو کر تو اپنے غلط نظریوں سے توبہ کر لے گی۔ اپنے باغی فلسفہ کو نقش باطل سمجھے گی۔ اور اپنی ہمراز سہیلی رفعت کی بھابی بن کر میرے دل کی اجڑی ہوئی بستی بسا لے گی جہاں صرف میں ہوں گا —— اور تو! مچلتی ہوئی تمناؤں کے بکھرے آبشار ہوں گے! اور محبت کی مئے ارغوانی کے چھلکتے ہوئے جام! کبھی میں تجھے پلاؤں گا اور کبھی تو مجھے! تو بات بات پر روٹھے گی میں تجھے منانے کیلئے تیرے حریم ناز کی جبہ سائی کروں گا اور تجھے مناؤں گا۔

اے لڑکی تیری نسائیت میری محبت کا کھلم کھلا اقرار نہیں کر سکتی میں خوب سمجھتا ہوں عورت کی محبت کا راز اگر افشا ہو جائے تو نسبت کی حلاوت میں فرق آ جاتا ہے!

تو نہ لکھ! ہر گز نہ لکھ! مجھے اب تیرے خطوط کا انتظار نہیں —— بلکہ خود تیرا انتظار ہے؟

جن دنوں میری پرسکون زندگی پر شمسہ کی جدائی کے فراق آگیں بادل منڈلا رہے تھے اور میری ساری سلامتی راتیں آنکھوں میں کٹ رہی تھیں شمسہ کے رومان پرور افسانے ادب اور افسانہ نگاری کی دنیا میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے، میں اس کو رفعت کی بھابی بنانے کیلئے خط پر خط، اور وہ بھی بلا انتظار جواب لکھ رہا تھا کہ میرے ایک بچپن کے ساتھی اور کالج فیلو قیوم صاحب کا ایک خط بہت دنوں کے بعد آیا لفافہ میں ایک تصویر تھی ایک اپنے خاص دوست کی، اور اپنے گئے ملاجی کا زندہ بیان اور اسکیچ —— اور وہ عبارت جیسی گھنی داڑھی بھرا بھرا چہرہ، ڈوبی ہوئی آنکھیں، ستواں ناک، بڑے بڑے کان، چوڑا چکلا سینہ! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی کانفرنس کا

خطبہ صدارت پڑھتے پڑھتے ادھورا چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ خط میں لکھا تھا۔

میرے پیارے .... سلام مسنون

آج بہت دنوں کے بعد تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں میرے ایک ادیب دوست رضوان کمالی بڑے پُر لطف آدمی ہیں، ایک عرصہ سے "مس شمسہ جمیل" کے فرضی نام سے افسانے لکھ رہے ہیں جو بہت مقبول ہو رہے ہیں کچھ دنوں سے ایک محترمہ رفعت احسان علے ...... بنارس سٹی ! رضوان کو اپنے بھائی کی شریک زندگی بنانا چاہتی ہیں ذرا پتہ لگاؤ ! یہ محترمہ کون صاحبہ ہیں اگر واقعی وہ خود میرے دوست رضوان کی شریک حیات بننا پسند کریں تو بسم اللہ ! یہ حاضر ہیں، رضوان کی تصویر بھیج رہا ہوں دیکھ لو، منت مانی ہے کہ شادی ہو جانے پر داڑھی منڈوا دیں گے، کیا تم میرے ساتھ مل کر یہ ثواب دارین حاصل کرنے میں میرا ہاتھ نہ بٹاؤ گے۔ ! امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے۔

تمہارا اپنا .... قیوم

نیچے کی سانس نیچے ! اوپر کی اوپر ! حیرت و استعجاب سے "اُس ننھی ادیبہ" کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ داڑھی، دوشیزگی، عصمت، عفت، محبت، ہجر و فراق کتنے متضاد زاویۂ نگاہ مجھے کچے ہی بن اور بگڑ رہے تھے اور میں سر کھجا کر سوچ رہا تھا کہ الٰہی اب میں کیا کروں .... !"

خواجہ آتش علیہ الرحمتہ کا ایک شعر ہے کہ

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ مرحوم نے یہ شعر دہلی جنگ عظیم سے پہلے کہا تھا ! یعنی کہ جب آتش جواں تھا ——— ورنہ فی زمانہ ۔ خودکشی کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کو موت مانگنے پر بھی نہ آتی ہو تو وہ فوراً کانپور، لکھنؤ ، لاہور، و کلکتہ وغیرہ ایسے بڑے شہروں کی طرف ہجرت کر جائے ——— اگر خدانخواستہ ریلوں میں انسانوں کی ریل پیل سے بچ بچا کر کہیں بخیریت ان شہروں میں پہنچ گیا تو بس سمجھ لیجئے کہ نہ محض "جیون کا سارا دکھ" دور ہو جائیگا بلکہ یہ نوبت پہونچ جائیگی بقول غالب ؂

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوا یہی کہ لکھنؤ پہونچکر مکان کا مسئلہ ایسا الجھ کر رہ گیا کہ الٰہی تیری پناہ ! ایسے ایسے دوستوں، عزیزوں اور رفیقوں نے آنکھیں پھیر لیں ——— جن سے یہ قطعی وعدہ ہو چکا تھا کہ اگر ہم تم سے پہلے مر جائیں تو ہماری قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنا دینا ——— اور اس پر

ایک کتبہ بھی لگا دینا ــــ مگر جب مکان کے متعلق اُن سے عرض کیا تو نگاہیں نیچی کر کے ہنسنے لگے یہ ہی لوگ ــــ!

" بھئی ــــ مکان ــــ مکان کا سوال تو بڑا ہی ٹیڑھا ہے آجکل ــــ
ــــ ہاں غریب خانہ حاضر ہے ــ!"

" جی مکان کیلئے آپ کہہ رہے ہیں اس منحوس شہر میں ــــ جس کا نام ہے لکھنؤ ــــ ابھی تو بہتر سمجھئے! مکان لینے کی نیت ہی بدل دیجئے!"

" میں کہتا ہوں قبرستانوں میں کرایہ کی قبریں بھی اس لڑائی کے زمانہ میں ملنا دشوار ہیں ــ آپ کہتے ہیں مکان لیجئے ــ!"

اچھا صاحب! کچھ اور باتیں کیجئے۔ اس مکان کے قصّے کو جانے ہی دیجئے اب۔"

" اگر ایسی ہی تکلیف ہے ــــ تو ــــ تو دس پانچ روز کیلئے ــــ میرے اسٹور روم میں آ جائیے ــــ اور کیا عرض کروں!"

" میں خود بے حد پریشان ہوں ــــ میرے ایک عزیز بمع بیوی بچّوں کے دو مہینے سے ہوٹل میں پڑے ہیں ــــ خاص عزیز ــــ بالکل خاص "
کرایہ کا کوئی سوال ہی نہ تھا ــــ اگر میرے قریب میں کوئی مکان خالی ہوتا ــــ آپ فوراً آ سکتے تھے!"

ادھر میری یہ حالت ہو رہی تھی کہ سوتے جاگتے ہر وقت یہی خیال رہتا کہ اگر کرایہ کا کوئی مکان مل جاتا تو اپنی جگہ پہ بیٹھ کر کچھ کام کر سکتا ــ!

اس طرح دوسروں کے مکانوں میں پڑے پڑے زندگی کا ٹنا اجیرن ہوتی چلی جا رہی ہے! کوئی ملنے والا عزیز دوست ایسا نہ تھا جس سے میں دیوانہ وار یہی درخواست

نہ کرنا کہ ——!

• جائی اگر تمہاری طرف کوئی مکان خالی ہو تو دلوا دو —— کرایہ جو کچھ ہو گا
دیدوں گا ——!

• ایک کمرہ —— غسلخانہ —— اور پائیخانہ بس اتنا ہی کافی ہے ——!
• سخت تکلیف ہے بغیر مکان کے! اجی تم سے یہ بھی نہیں ہوتا —— اتنا
کہ ایک مکان ہی تلاش کردو! ——

اجی —— ملاجی! آج جمعہ کی نماز کے بعد! آپ ہی اعلان کر دیجئے
کہ مکان تلاش کر دینے والے کو پانچ روپیہ نقد انعام دیا جائیگا۔ اکثر تو یہ نوبت آجاتی کہ جب
کسی نئے صاحب سے شرفِ تعارف حاصل ہوتا تو میں یہ کہنے کے بعد —— کہ ——
آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی —— بہت ہی —— ہاں اگر آپ کی طرف کوئی
مکان خالی ہو تو بتائیے —— مکان کی سخت تکلیف ہے مجھکو ——!
ظاہر ہے کہ اس قسم کی بدحواسانہ باتوں کا جواب ہر سمجھدار آدمی یہی دیسکتا ہے:
کہ! مکان خالی تو نہیں ہے —— ہاں اگر خالی ہوا —— تو اطلاع دوں گا ——!
مکان کی تلاش و جستجو میں، میں اسقدر دیوانہ ہو رہا تھا کہ یار لوگوں نے بلا
سوچے ہوئے کہہ ——!

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

میری گھبراہٹوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت ہی خطرناک قسم
کا ایک پروگرام بنا ڈالا ——

ہوا یکہ بشیر صاحب میرے تقاضوں سے بہت تنگ آ چکے تھے ـــــــ
ـــ اور جب ان سے ملاقات ہوتی بطور یاددہانی مکان کے متعلق ضرور یاد دلا دیتا ـــــ
ـــ ایک دن آئے کچھ گھبرائے سے کہنے لگے !

مل گیا مکان ـــــ لاؤ مٹھائی کھلاؤ ! فوراً ـــ ابھی اسی وقت !

اس شاندار کامیابی پر قریب تھا کہ میں اچھل ہی پڑتا تھا ـــ اور فرطِ انبساط سے بشیر سے چمٹ ہی جانا چاہتا تھا ! دونوں آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے تھے ! پوچھا میں نے ۔

کہاں ـــ کہاں ! جلدی بتاؤ جلدی !

ابھی میں کہتا ہوں ـــ دیر ـــ دیر کیوں کر رہے ہو ! کپڑے پہن کر فوراً جاؤ ! بشیر کہنے لگا ! مجھے تو چھٹی نہیں ہے ۔ آفس جا رہا ہوں ! تم فوراً چلے جاؤ ! خاں صاحب سے کہنا وہ فوراً ہی دکھا دیں گے گھر ـــ !

خاں صاحب سے کیا کہوں گا ـــ ؟ میں نے پوچھا !

بس یہی کہنا ـــ کہنا کہ جس مکان کے بارہ میں بشیر آپ ـــ سے کہہ گئے ہیں ۔ دکھا دیجئے ـــ باقی سب کچھ میں خود طے کر دوں گا ـــ !

خوشی کے مارے میرا عجیب حال تھا ۔ یہاں تک کہ میں نے گھبراہٹ میں محض قمیص کے اوپر بنیان ـــ اور پھر شیروانی پہن لی ! بشیر کو دفتر جانے کی جلدی تھی ـــ
ـــ اور وہ جانے کیلئے بیقرار تھا ، یکایک مجھے خیال آ گیا !

ہاں ! ـــ یہ تو بتایا نہیں ـــ کہ مکان ہے کہاں ـــ اور خاں صاحب کا نام ـــ !

بشیر کہنے لگا۔
لاحول ولاقوۃ ! میں کہتا ہوں تم بھی ! بس کیا کہوں ! اجی خان صاحب کو نہیں جانتے !
وہی جو خیالی گنج کی موڑ پر رہتے ہیں ۔ !
بہت عالیشان مکان ہے اُن کا ۔
کیا نام بتایا ۔ میں نے پوچھا بشیر سے !
کہہ تو رہا ہوں ! کسی سے پوچھ لینا ـــــ عبدالصمد خان صاحب شاہجہاں پور کے رئیس اعظم ہیں ـــــ نا ۔

بشیر یہ سب کچھ بتا کر جلدی سے دفتر روانہ ہو گیا ـــــ اور میں خیالی گنج کیطرف !
راستے بھر سوچتا رہا ! کم از کم چھ کمرے اور ایک ڈرائنگ روم تو ضرور ہو گا ـــــ ایک کمرے میں سامان واماں ـــــ ایک کھانے کا کمرہ ہوا ۔ ایک کمرے میں لکھنے پڑھنے کا سامان ـــــ باقی بچا ایک کمرہ اس میں سونے کا انتظام کر لیا جاوے گا ـــــ اور ڈرائنگ روم ۔ ! ہاں وہ تو علیحدہ چیز ہے ! اب رہا باورچی خانہ ۔ تو دراصل میں اس گرانی کے زمانہ میں ذرا اس کے خلاف ہوں کہ تون تیل اور لکڑی کا دھندا پھیلایا جائے !

بس ہوٹل اچھے ! نہ مہمانوں کا جھگڑا ـــــ نہ راشننگ کا کھٹکا ! ـــــ لیکن ـــــ لیکن ذرا ان ہندوستانی مکانات کے پائخانے اور غسلخانے کچھ ایسے ہی ویسے ہوتے ہیں ـــــ خیر دیکھا جائیگا ۔ جب رہوں گا رفتہ رفتہ سب ٹھیک کرا لوں گا ! بعد میں ـــــ تھوڑا تھوڑا کرایہ سے وضع ہوتا رہیگا ! ـــــ یہ بجلی کے بلب اتنے مہنگے ہو گئے ہیں کہ توبہ ! ـــــ اگر ٹھیک ٹھاک بلب نہ لگے ہوئے تو وہ بھی بدلوانا پڑیں گے ـــــ غالباً سفیدی وغیرہ تو انہوں نے کرا ہی رکھی ہو گی ـــــ شاہجہاں پور کے رئیس اعظم ـــــ پھر پٹھان قسم کے ! جن کے بارے میں سنا ہے کہ اگر ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو ـــــ !

اب سوال یہ ہے کہ جلدی سے جلدی کب تک خالی کردیں گے وہ مکان کو ـــ بشیر کہتا تھا کہ اسی ہفتے اُن کے بچے چلے جائیں گے آپ اطمینان سے منتقل ہو جائیے گا ـــ اپنا گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے دراصل! دوست احباب کے یہاں پڑا رہنا حقیقتاً بڑی بے حیائی ہے ـــ اور تنگی بھی بہت! نہ کسی ملنے والے کو بُلا سکتے ہیں ـ ـــ نہ اطمینان سے سو سکتے ہیں ـــ نہ کچھ ـــ نہ کچھ! پرائی جگہ ـــ پرایا ماحول! بچے شرارت کر رہے ہیں، تم چپ، وہ تھپڑ بھی نہیں مار سکتے ان کو ـــ ریڈیو بج رہا ہے، غزلیں سنتے سنتے جی لپٹ گیا ہے ـــ مگر زبان سے اُف نہیں کر سکتے!

فی الحال ـــ فی الحال ـــ سب فرنیچر بعد میں منگالوں گا ـــ اس میں کون سا عیب! بڑے بڑے لوگ بغیر فرنیچر کے ساری زندگی بسر کر لیتے ہیں ـــ بس دو چار مہینے کی بات ہے، دھیرے دھیرے سارا سامان منگوا لوں گا! بشیر بھی کتنا اچھا آدمی ہے! مخلص دوستوں کی بھی اس زمانے میں کوئی کمی نہیں ـــ.

خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے تم خیالوں ہی خیالوں میں وہاں پہنچے جہاں بشیر کی بتائی ہوئی عمارت مسکرانے لگی! اچھا خاصہ ایک منزلہ نہیں دو منزلہ مکان تھا ـــ قدیم مشرقی طرز کا بنا ہوا مگر اصل میں بہت ڈھنگ سے کافی خوبصورت بنا ہوا تھا لب سڑک! سامنے برآمدے میں ایک دراز قامت، ادھیڑ عمر ـــ مرد سلمان فتحپوری مونڈھے پر بیٹھے ہوئے حقّے سے شوق فرما رہے تھے، چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے بجائے صرف خوبصورت داڑھی ـــ بھویں گھنی گھنی، بڑی بڑی آنکھیں!

السلام علیکم بھائی ـــ میں نے پوچھا، مجھے محمد عمر خاں صاحب سے نیاز حاصل کرنا ہے!

جی ـــ کہئے، فرمایئے ـــ فرمایئے! وہ بولے۔

بشیر صاحب نے۔ میں نے برابر پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے
کہا: بھیجا ہے مجھے!
بشیر صاحب — کون! وہ کہنے لگے! اچھا — اچھا — جی ہاں
— یہی مکان ہے وہ!
سچویشن تو " میں نے ادب سے عرض کیا " بہت ہی اچھی ہے
نہایت کھلی ہوئی جگہ! لب سڑک!
مجھے " خاں صاحب بولے " ایسے مکانوں سے سخت نفرت ہے
جو گلیوں میں ہوتے ہیں —! میں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا۔ چاہے مکان
چھوٹا ہی کیوں نہ ہو مگر اچھی جگہ پر ہونا چاہیئے۔
کتنے کمرے ہیں اس مکان میں۔ " میں نے پوچھا۔
چھ کمرے نیچے۔ " خاں صاحب انگلیوں پر جوڑ جوڑ کر بتلانے لگے " — اور دو اوپر
— ایک ڈرائنگ روم — اور ایک نوکروں کا کمرہ —!
بہت کافی — بلکہ میں نے کہا! ضرورت سے بھی زیادہ! سچ پوچھیئے
تو اس سے کم میں ایک سلیقہ مند آدمی کا کام بھی نہیں چل سکتا —!
جی ہاں! خاں صاحب نے حقے کا کش کھینچتے ہوئے جواب دیا!
پچاس ہزار لگا دیئے! اس اتنے سے گھروندے میں — اور اب تو لڑائی کی وجہ
سے سامان ہی نہیں ملتا — ورنہ ابھی تو نامکمل ہے — آپ سمجھیں!
خیر وہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہو جائیگا " میں نے کہا " آج کل
تو بہت مشکل ہے نشان بنوانا!
اب آپ ہی دیکھ لیجئے " خاں صاحب بدستور حقہ پیتے ہوئے بولے "

جو مزہ چار آنے میں ملتا تھا! آپ سمجھیں! ایک روپیہ میں بھی اب نہیں ملتا ـــــ اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر آدمی مل بھی جائے ـــــ تو بھی کیا ـــــ جب جلانے کے لئے لکڑی نہیں ملتی۔ مکان بنانے کیلئے کہاں سے مل جائیگی ـــــ اس کا نقشہ! ایک بنگالی انجنیئر میرے دوست تھے انہوں نے بنایا تھا ـــــ آپ سمجھیں! ان بنگالیوں کو انجنیئری میں بڑا ہی ملکہ ہوتا ہے!

اگر زحمت نہ ہو ـــــ میں بولا، تو ذرا تکلیف کر کے دکھا دیجئے گا ـــــ واقعی نہائیت ہی لاجواب نقشہ ہے اس مکان کا! بس آنکھوں میں اس کی تصویر کھپی جاتی ہے۔!

جی ہاں ـــــ چلیئے! خاں صاحب نے ملازم کو آواز دے کر کہا ـــــ ذرا اندر پردہ کرا دینا!

وہ بدستور حقّے سے شوق فرما رہے تھے بلا شرکتِ غیرے! نوکر نے آکر کہا کہ پردہ ہو گیا ـــــ آگے آگے خاں صاحب اور پیچھے پیچھے میں! دونوں اندر پہنچے! خانصاحب نے قلعۂ دلّی کے گائڈ کی طرح کہنا شروع کیا!

" اس کمرے کا طول ۳۰ فٹ اور عرض ۲۰ فٹ کے قریب ہے! دیکھیئے نا ـــــ! میں نے کتنی مناسب جگہ پر روشندان لگوائے ہیں۔

جی ہاں! بہت ہی مناسب! میں نے خاں صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا! کیا کہنا صاحب ـــــ مجھے بھی عمارتوں کا بڑا شوق ہے بلکہ یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے جو نیا مکان بنوایا ہے اس کا پورا نقشہ خود میرا بنایا ہوا ہے!

آپ سمجھیں " خاں صاحب کہنے لگے " یہ چیز آپ کسی دوسری عمارت میں نہ پائینگے۔ جو یہاں نظر آرہی ہے آپ کو ـــــ یہ جالی جو دروازوں کے

میں نے ہاں میں ہاں ملا دی!

صحن کی کشادگی پر تھوڑی دیر مباحثہ ہوتا رہا ۔۔۔ اور میں نے کسی جگہ پر یہ ثابت نہیں ہونے دیا کہ میں علم العمارات کا ماہر نہیں ہوں ۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر خاں صاحب نے کہیں یہ سمجھ لیا کہ اس شخص میں مکان ٹھکانے سے رکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو قطعاً وہ اپنا مکان مجھے کرایہ پر نہ دیں گے ۔۔۔!

میں اور خاں صاحب اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے باہری برآمدے میں آ چکے تھے! میں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ۔!

آپ کے بچے اسی ہفتہ وطن جا رہے ہیں ۔۔۔! خاں صاحب نے اطمینان سے حقہ کی نے ہونٹوں میں دباتے ہوئے جواب دیا ۔۔۔!

"جی ہاں ۔۔۔ یہ لوگ تو غالباً پرسوں ڈیرہ سے چلے جائیں گے ۔۔۔!

وہیں شائد انبالہ تک جاؤں ۔۔۔! آپ سمجھیں آج کل سفر کرنا" "اور کرایہ" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا ۔ کیا ہو گا ۔۔۔!

انٹر کلاس کا ۔۔۔ خاں صاحب نے حقہ کا کش کھینچتے ہوئے کہا ۔۔۔ کوئی تین روپیہ" ۔۔۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔۔۔

جی ہاں! ۔۔۔ آپ سمجھیں ۔۔۔ مگر صاحب! خاں صاحب بولے! آجکل کا انٹر تھرڈ سے بھی بدتر ہوتا ہے ۔۔۔!

بس کچھ نہ پوچھیئے! میں نے جھینپ کر جواب دیا ۔۔۔ آج کل سفر کرنا ڈوب مرنے سے زیادہ مشکل ہے کم از کم! ۔۔۔ لیکن کچھ آپ نے بتایا نہیں ۔۔۔ کرائے کی بابت!

کیسا کرایہ ۔۔۔ خاں صاحب چونک پڑے!

"ٹکاہیاں"

ایک دھیلے کے مٹر —— دھیلے کے کچالو!
ڈبل کی پھلکیاں —— دہی کی!
ایک پیسے کے دہی بڑے دینا —— مجھے بھی!
میں کتنی دیر سے کھڑی ہوں چندرو چاچا۔ مجھے بھی —— ڈبل کے کچالو
خوب کھٹے کر دینا —!

"چندرو چاچا" نے گھنی مونچھوں سے پھنکار مارتے ہوئے نظر اٹھا کر
دیکھا —— تو جے شری کھڑی تھی! مٹر، کچالو، دہی کے بڑے! کھٹ مٹھی پھلکیاں
—— اور بناسپتی گھی میں تلے ہوئے "سیو" جیسے اس کے منہ میں آئے جا رہے
تھے! کھٹاس کے ذائقے سے اس کے منہ میں پانی کے فوارے چھوٹ رہے تھے!
پھیکا پھیکا منہ پیپے کے نیچے رکھے ہوئے گلاس کی طرح بار بار تھوک سے بھر جاتا —
—— اور وہ بےچین ہوئی جا رہی تھی۔
چندرو چاچا کو وہ چندرو چاچا ہی تو نہ کہتی تھی جب سے لچھمن اسے شیوپور

سے بھگا کر لایا تھا۔ لچھمن سے اس کو کچھ پریم تو تھا نہیں ــــ مگر ہوا یہ ایک دن کہ
جب وہ صبح صبح گھاٹ پر کپڑوں کی لادی لئے جا رہی تھی! بہت میلے کچیلے کپڑے!
نندو دادا کی دھوتی، اسر جو بابا کا انگوچھا! ــــ اور کشن کا جانگیا! جو وہ لام سے بھاگتے وقت
اپنے ساتھ لایا تھا ــــ جس پر ایک دفعہ جب اس نے دیکھا تھا تو نہ جانے کیسے دھبے
پڑے ہوئے تھے ــــ رام جانے کیسے! اب تو وہ پکڑ لیا گیا ــــ کشن کا جانگیا! اب
کرن بابو کے ہاتھ لگ گیا جو شہر میں پڑھتے ہیں ــــ گرمیوں کی چھٹیوں میں پارسال
کی طرح جب اس سال آئے تھے تو ایک دن گھاٹ پر جو آئے تھے مجھ سے کہنے
لگے ــــ کہنے لگے ــــ کہ جے شری تو بڑی سندر ہے! میں نے کوئی
جواب نہ دیا تو وہ اپنی ایک دھوتی دے گئے۔ کہ کل سے گھاٹ دھو کر جلدی سے
دینا … دھوتی میں ایک پانچ روپیہ کا نوٹ بندھا تھا ــــ وہ چلے گئے ہیں
جب وہ پہن کر دھوتی لیکر گئی تو یہ نوٹ بھی لیتی گئی ــــ پر انہوں نے لیا نہیں!
لچھمن آگے آگے جا رہا تھا ــــ اور میں پیچھے پیچھے، کچھ فاصلے سے
چل رہی تھی! لچھمن کا گٹھر بہت بھاری تھا، مجھے دیکھ کر کہنے لگا ــــ!
جے شری ــــ ذرا سہارا دینا ــــ تھک گیا ہوں ــــ!
تب میں نے اپنی گٹھری اتار کر زمین پر رکھ دی، اور اس کو سہارا دینے لگی ــــ
اچانک لچھمن کا گٹھر دھم سے جا کر گرا اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی جگہ پر رہ گئے ــــ لچھمن
نے بھینچتے ہوئے کہا! تو بڑی ظالم ہے! "مریا"! میں ایسا گھبرا گئی کہ کچھ کہہ نہ سکی۔
دوسرے دن سارے گاؤں میں ہلہ ہو گیا کہ لچھمن نے جے شری ......
کی چٹکی باندھ کر پنچایت کا کھانا لگا دیا! لچھمن کہنے لگا ــــ ایک دن کہ اب تو میرے
ساتھ بدنام ہو ہی چکی ہے ــــ چل کہیں بھاگ چلیں ــــ یہ جیون آنند میں کٹ

جلائے گا، بڑے آنند میں ــــ!

یہی ہوا بن کہے سُنے ایک دن رات کو اندھیاری چھائی ہوئی تھی۔ چھمن نے جب سیٹی بجائی تو میں دبے پاؤں باہر نکل کر اس کے ساتھ ہولی ــــ دونوں چپکے چپکے چل رہے تھے ــــ ذرا سے کھٹکے پر ٹھہر جاتے! سویرا ہوتے ہوتے ایک باغ میں جب پہنچے تو اس نے مجھے ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں بٹھا دیا! دن بھر وہ میرے پاس بیٹھا رہا! بڑا پریم آنند تھا ــ! ایسا جیسا اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ــــ شام کو اسٹیشن پہنچے، اور وہاں سے شہر!

ایک چھوٹی سی کوٹھری لیکر ہم دونوں بہت دنوں تک رہتے رہے! پھر ایک دن سپاہیوں نے پکڑ لیا دونوں کو! مقدمہ چلا۔ چھمن کو سزا ہوئی ــــ اور میں یہاں پہونچ گئی!

اس نند و چاچا کو سبھی چاچا کہتے ہیں۔ اس لئے میں بھی کہتی ہوں ــــ پر ایک دن اس نے بھی وہی بات کہی جو سب کہتے ہیں ــــ میں نے کہا چندرو چاچا ــــ اگر تم نے اب کی ایسی بات کہی تو اپنے حوالدار سے کہدوں گی ــ؟

بڑی دیر تک کھڑے کھڑے وہ یہی سب کچھ سوچتی رہی!

چندرو جلدی جلدی مٹر کچالو کے دانے بنا کر بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ بے شری اگرچہ بہت پہلے آچکی تھی۔ لیکن اسے وہ دیر ہی میں سودا دیتا تھا۔!

سارے چکلے میں چندرو چاچا کی چاٹ بہت مشہور تھی ــــ اور کھٹ مٹھی پھلکیاں تو اتنی زیادہ کہ اس سے زیادہ کوئی دوسری چیز نہ بکتی!

چار چار آٹھ آٹھ آنے کر کے رات بھر میں یہ سب کتنا کما لیتی تھیں ــــ کوئی انتہا نہیں! دو دو روپیہ کے پیسے جمع ہو جاتے تھے! اگر تاڑی اور شراب پی پی کر

چندرو نے ـــــ ترچھی نظروں سے دیکھا ـــــ جے شری دو نے سے چمٹی ہوئی تھی۔

چاٹ مصالحہ کی! چندرو نے ایک تان لگائی۔ اور خالی خوانچہ اٹھا کر چل دیا۔

جے شری کا منہ مرچ کی تیزی سے بھنّا اٹھا! گلی میں لگے ہوئے بمبے کے پاس پہونچکر اس نے چلّو بھر بھر کے پانی پینا شروع کر دیا ـــــ نہ جانے وہ کتنا پانی پینا چاہتی تھی۔

"کیا سارا بمبا پی جائیگی" چمپا نے میلی ساری میں صابن رگڑتے ہوئے کہا۔

جے شری نے ہاتھ روک لیا! جیسے اسکو خود بخود خیال آ گیا۔ کہنے لگی!

ہاں دیدی ـــ یہ تو بتا میں نے ایک بات سنی ہے! ـــــ سنا ہے کہ تو میرے حوالدار پر ڈورے ڈال رہی ہے!

"کون کہتا ہے" چمپا نے پوچھا!

کوئی کہتا ہے!" وہ بولی" تو بتا کیا یہ جھوٹ ہے؟

اگر جھوٹ نہیں ہے تو" چمپا نے جواب دیا" تو سچ بھی نہیں!

کیا مطلب؟ جے شری نے کہا!

"مطلب یہی" چمپا بولی" وہ تیرا حوالدار آیا تھا اس دن: کہتا تھا کہ تو مجھ سے تعلق کر لے!

پھر ـــــ پھر ـــــ تو نے کیا جواب دیا۔ جے شری نے پوچھا!

"میں نے کہا ـــــ وہ کہنے لگی: کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں ـــــ!"

ہی اشاندو ہی تین سال کی ہوئی ہے سزا ـــــ وہ نردوش تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ بھاگنے پر راضی نہ ہوتی تو وہ کیسے مجھے بھگا لاتا ـــــ! مگر جب تک وہ چھوٹ کر نہیں آتا پیٹ بھی بھرنا ہے اور تن بھی ڈھانپنا،

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن محبت میں ساجھے دار نہیں بنا سکتی، بجے شری کے دل پر بھی حوالدار کی بے اعتنائی سے ایک چوٹ سی لگی ـ وہ سوچنے لگی آج رات کو جب حوالدار آئیگا تو صاف صاف کہہ دوں گی کہ اسی ہیسوا چمپا کے یہاں جائے ـــــ میری سوت کے پاس جس سے اقرار کر آیا ہے ـــــ کہوں گی ـــ حرامی سے ـ کہ تو تو کہتا تھا کہ اگر تو کسی اور کے پاس جائیگی تو جڑ موڑ سے ناک کاٹ لوں گا، ـــــ کہو تو اب تمہاری ناک دانت سے کاٹ لوں حوالدار صاحب ـــــ! اور یہ ہرجائی چمپا کیا نباہ سکے گی اس حوالدار کے بچے کو، جس نے کسی کالے گورے کو چھوڑا ہی نہیں ـــــ کمینی ـــــ بدذات! چاچا کہتی ہے مگر چنید رو چاٹ والے پر بھی بند نہ رہ سکی ـــــ کہتا تھا اس دن چنید رو چاچا ـــــ کہ چمپا کو میں نے پورے سولہ گنڈے دیئے تھے ـــ تو بھی لے لے ـــ بجے شری۔

دونوں وقت مل رہے تھے ـ بجے شری جب اپنی کوٹھری سے باہر نکلی! ساری گلی میں سب رنڈیاں بناؤ سنگھار کر کے اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازوں میں بیٹھ چکی تھیں ـــــ میلی میلی ساریاں پہنے ـــــ ملگجے جمپر! پچکے ہوئے گالوں پر جاپانی پاوڈر ـــــ اور لبوں پر سرخیاں چمک رہی تھیں ـــــ کاجل میں رنگی ہوئی آنکھیں ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر بار بار کھلنے اور بند ہونے لگتیں تھیں ـــــ بے جھجک کھانس کھنکار کر خواہ مخواہ راہگیروں کو متوجہ کرتیں۔ جن میں سے بہتیرے کھانس کھنکار کر اشاروں کا جواب دے رہے تھے ـــ!

ہوں ـــــ پھر کون بھتیجی اپنے چندرو چاچا کے پاس نہیں رہی ہے ـــــ گنو خود کہتی تھی کہ چاچا اس کے یہاں بہت دنوں آتا جاتا رہا! پر ان پولیس والوں کا بھروسہ ہی کیا ـــــ اگر کل کہیں بدلی ہو گئی تو بس بات بھی نہ پوچھیں گے! اور چندرو چاچا سے اگر جڑ گئی تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آنند ہی آنند ہیں ـــــ!

[illegible] ـــــ چندرو چاچا نے دیکھا وہ اب تک کھڑی تھی۔ جلدی سے ایک دونے میں چاٹ بنا کر بڑھا دی!

لو ـــــ چاٹ ہی مانگی تھی نا ـــــ تم نے!

نہیں تو ـــــ جے شری نے کہا ـــــ میں نے تو کچھ نہیں مانگا!

خیر ـــــ کھاؤ لو ـــــ ..... وہ کہنے لگا! کھا لو۔ کھا لو! نہیں ـــــ جے شری بولی! نہیں چندرو چاچا.. ...چاچا کہتے کہتے وہ رک گئی! مجھے تم سے کچھ کام ہے چندرو نا ـــــ!

مجھ سے "چندرو بوکھلا سا گیا" کیا کام ہے مجھ سے ـــــ؟

ہے ایک کام ـــــ اس نے کہا! رات کو آنا بتاؤں گی!

نہیں ابھی بتا دو "چندرو بولا" مجھے چین نہ پڑے گا جے شری ـــــ جلدی بتاؤ کیا کام ہے ـــــ؟

گھبرانے کی کیا ضرورت! جب آؤ گے بتا دوں گی ـــــ جے شری نے کہا! ـــــ آؤ گے نا رات کو ـــــ؟

ہاں.... ....ہاں! چندرو نے جواب دیا۔ ضرور ـــــ ضرور

جے شری پنی کوٹھری میں چلی گئی۔ پاس والی کوٹھری میں زیادہ مجمع تھا ـــــ گاہکوں کی بھیڑ۔ تاڑی کے نشہ میں بدمست تانگے والے اور مزدور ـــــ دن بھر ملوں

اور حوالدار کا بچہ تو پورے تیس بھی نہیں دیتا مہینہ بھر میں ـــــ حوالدار کا بچہ ناک کیا کاٹ لے گا ـــــ میں خود دانتوں سے کاٹ لوں گی اس کی ناک ـــــ آج آئیگا گشت میں تو دروازہ ہی نہ کھولوں گی ـــــ بس ہیں اور چندرو ـــــ چا ـــــ چا ـــــ ہونگے امٹی کے تیل کا دیا ـــــ کنٹرول کی پابندیوں کی وجہ سے روتے روتے بجھ گیا تھا ـــــ جب سے مٹی کے تیل کا راشننگ ہو گیا گھروں میں قبروں سے زیادہ اندھیرا ہو جاتا ہے! کوٹھری کا دروازہ بھیڑا ہوا تھا ہر طرف دھوئیں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی ـــــ اور وہ تیز تیز سانسیں لے رہی تھی بالکل سناٹے میں ـــــ گلی میں آنے جانے والوں کی آہٹ بھی ساون بھادوں کی بوندیوں کی طرح تھم سی گئی تھی! جنگلہ گھاٹ میں کھٹملوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا ـــــ گندہ خون وہ شائد پینا نہیں چاہتے تھے ـــ!

زور زور سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں ـــــ حوالدار وزاسی طرح دو چار سیٹیاں بجا کر چپکے چپکے قدم رکھتا ہوا اس کی کوٹھری میں آ جایا کرتا تھا۔ تاکہ لانگ بوٹ کی آوازیں دوسروں کے کانوں میں نہ پہنچے۔ بھاری بھاری لانگ بوٹوں کی آوازیں دھیرے دھیرے آنے لگیں ـــــ اور کسی نے چپکے سے چمپا کی کوٹھری کا دروازہ کھولا ـــ اور پھر فوراً ہی بند کر لیا ـــ!

بے شری کا ہاتھ لاشعوری طریقہ پر اپنی ناک کیطرف اُٹھ گیا ـــــ حوالدار حرامی کی ناک ـــــ جی چاہتا ہے دانت سے کاٹ لوں کمینہ کہیں کا ـــــ کہتا تھا ناک کاٹ لوں گا تیری ـــــ اگر کسی اور مرد کے پاس دیکھا۔

اسکی کوٹھری کے دروازے بھی دھیرے دھیرے چلنے لگے ـــــ!

ایک دوسرے سے الگ ہو کر پھر گلے مل گئے ـــــ!

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ـــــ کون چندرو ـــــ چا ـــــ چا چا کہتے کہتے وہ جھجک

گئی ——!

موٹے موٹے لانگ بوٹ لکڑی کے سٹول سے ٹکرائے — !

حوالدار نے ماچس جلا کر دیکھا ——

اب تک جاگ رہی ہے —— تو بھی شری —؟

ماموں ذات

بعض ماموں جان قسم کے آدمی کو تنِ تنہا سفر کرنے سے احتیاط کرنا چاہیئے ، ورنہ ممکن ہے وہ " ماموں ذات " ہو جائے ؟ —

آپ یقین مان لیں کہ آگرے اور بریلی کے سفر کرنے والے ننانوے فی عدی پاگل نہیں ہوتے ؟ بالکل اسی طرح جیسے ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہو سکتی ۔ ورنہ آپ جانتے ہیں یہ ریلوے والے صرف ایک ڈبے میں ایک ہی جانور بھیجا کرتے ان جگہوں پر ! اور آج کل جیسی گھما گھمی کی لڑائی میں تو ان چیزوں پر یقیناً کنٹرول کر دیا جاتا مگر میں تو عرض کر رہا ہوں لڑائی سے بہت پہلے کا قصہ ، جب ایک پورے جوان جہاں انٹر کلاس میں تنِ تنہا ایک عدد مسافر کا آگرے یا بریلی سفر کرنا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ حضرت آگرے جا رہے ہیں علاج کیلئے ! بریلی کے پاگل خانے میں آپ کے لئے سیٹ ریزرو ہو چکی ہے —!

" آنولہ " کے اسٹیشن پر بے زبان ثروت نے گھبراہٹ میں ود زنانے انٹر ... رنگ برنگی ساڑیوں ۔ کالے کالے برقعوں...... اور مارواڑی عورتوں ... گئی ۔

" ... سمجھتے نہیں ... زنانہ ؟

" رہے نرے احمق ہی! .... اور بقرعید میں کیا ہوگا ...؟
یہ مسئلہ ابھی ہلکی ہلکی سسکراہٹوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ دونوں سیٹ کے بیچ میں رکھے ہوئے " دیگچوان سے خود بخود تونتکی کے نگاڑے کی ایسی آواز آنا شروع ہوگئی۔
کڑ ..... کڑ ..... کڑ ..... کڑا ..... ٹرا ..... ٹرا ..... کڑ ..... ، کھو! ...... کھوں ...... کھی ..... کھ "

سارے کمپارٹمنٹ میں رُلانے والی گیس کا دھواں بھر گیا۔ ثروت تو کھلاہٹ میں قریب تھا کہ اوندھے مُنہ گر پڑے ابپر! میں نے سہارا دیکر بٹھا لیا۔
جس طرح چینا بطخ سطح آب پر تیرتی ہے .... بالکل اسی طرح سہاگ سیج پر پھسل رہے تھے! اور کڑ ..... کڑ ..... کڑ ..... ٹرا ..... کڑ ..... کرا ..... ک ... ا ... ٹر "

" اجی حضت (حضرت) یہ کونسا اسٹیشن ہے!"
ہڈیوں سے بنی ہوئی پوری بتیسی مُنہ کے باہر جھانکنے لگی۔
" جی ...... حضت ...... یہ اٹاوہ ہے "
میں نے کہا!
پھر کڑ ..... کڑ ..... کڑ ..... شروع ہوگئی اور کھڑکی سے مُنہ نکالکر ....
کھوں ..... کھوں ...... کھوں!
ذرا سی تکلیف ہوگی ...... جا ..... ناب کو ..... پاندان دیجئے گا!
ثروت نے بڑھ کر نہایت سعادت مندانہ طریقہ پر پاندان ان کی طرف بڑھا دیا!
" دو نہایت میگزین سائز ہو کے موٹے موٹے پان بنا کر مرادآبادی اُگالدان جیسے چوڑے چکلے کلّوں میں دبائے گئے ...... اور پاندان بند ہوگیا!

توبہ کیجیے! پان کو پوچھے گا۔ حقّہ بڑھائیگا اس طرف لعنت ہے منحوس کی صورت پر! خدا
ہی ہے جو آج روٹی ملے! صورت دیکھی ہے ایسے شوم کی! لاحول ولا ......!

میں نے ثروت کی طرف گھور کر دیکھا..... وہ ..... آدمی سمجھدار تھا گو کہ تھا
بھیّا بیزبان! مگر سمجھ گیا کہ مجھے غصّہ آرہا ہے اس احمق پر.....! اور نہ مجھے اس کی باتوں
سے خوشی نہیں ہوئی......!

واقعی اس بدتہذیبی کی حد بھی تھی کوئی۔ سارے کمپارٹمنٹ کو گھیر رکھا ہے۔
کمبخت نے! اور پھر پان تک کو نہیں پوچھتا..... ثروت نے معنی خیز نگاہیں ڈال کر
پوچھا......!

پھر.......!

بیٹھے رہو....... دیکھو..... چچا کو چچا بنا کر نہ چھوڑا....... ہو تو کہنا۔!

میں نے چپکے سے کہا وہ مسکرانے لگا...... ان کی طرف دیکھکر! وہ بدستور
کھڑکی سے منہ لگائے ہوئے "جگالی" فرما رہے تھے ...... ہم لوگوں کی بات چیت
پہیوں کی بے ہنگام کھڑکھڑاہٹ میں گم ہو گئی۔

درجہ بھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ گاڑی کی رفتار دھیمی ہونا شروع ہو گئی
ہندو پانی...... مسلم پان پوری مٹھائی۔ بابو جی قلی....... اجی گارڈ صاحب ٹھہریئے
گا...... میں ٹکٹ لیلوں! "دو آنے درجن کیلے" کی آوازوں سے معلوم ہو گیا ایک چھوٹا
سا اسٹیشن ہے۔ ٹرین رکتے ہی پھر کڑ..... کڑ..... کر حقّہ بولنے لگا۔

"قبلہ" نے سیاہ کلکتیا سلیپر کے منہ میں دونوں "گونڈ" ڈالدیئے۔ اچھے
خاصے تن و توش کے واقع ہوئے تھے۔ خضاب سے رنگی ہوئی فرنچ کٹ ڈاڑھی، مہین
کتری ہوئی مونچھیں اور بالکل انگریزی طریقہ پر کٹے ہوئے بال! بیس چھبیس سائز توند

کے توند پر ململ کا کرتا اس طرح مڑھا ہوا تھا جیسے ہندوستان کی قسمت پہ۔ ہوائٹ پیپر لپیٹ دیا گیا ہو......ریشمی آزار بند سے کسے ہوئے غرارے دار پائجامے سے۔ توند کے مد و جزر کا کچھ کچھ پتہ ضرور چلتا۔۔۔!

سیٹ پر سے پانی کا لوٹا اٹھالیا گیا۔

کٹر......کٹر......کٹر......پھر کو......کھوں......کہ......کھوں!

اوگالدان جیسے منہ سے دھوئیں میں لپٹی ہوئی عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔

گارڈ نے ہری جھنڈی دکھلائی۔ وسل بجائی...... ہاتھ ہلایا۔ ٹرین چلنے لگی۔

...چک......چک......چک......! حضرت نے کھڑے کھڑے

ریشمی آزار بند کو ڈھیلا کرتے ہوئے حقے کے دو چار کش اور مار دیئے!

معلوم ایسا ہوتا تھا۔ کہ دمہ، قبض اور پرانے قسم کے بواسیر کا شکار ہیں۔ جب تک دو چار حقے جلا نہیں لیتے۔ پائخانہ سُکتا ہی نہیں! اجابت ہی نہیں ہوتی گھنٹوں پائخانہ میں بیٹھتے ہوں گے جب کہیں جا کر......!

میں نے سوچ لیا۔ جائیں تو قبلہ پائخانے! اگر آج ان کی ساری بدتہذیبی نہ بھلادی ہو تو......کوئی بات ہی نہیں۔۔۔!

بس یہی وقت ہے! موقعہ پر چوکنا سخت غلطی اور حماقت...! ساری تدبیریں سمجھ میں آچکی تھیں جیسے ہی تشریف لے گئے پائخانے میں۔ میں نے جلدی سے پھلوں کی ٹوکری سے رسی کھولکر پائخانے کے دروازے کو نہایت مضبوطی کے ساتھ جکڑ دیا۔۔۔!

...ہے...اندر......کھانس بھی رہے تھے......اور کانکھ بھی۔۔۔!

ثروت بھیا بے زبان کی طرح بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔
"ارے کمبخت کیا دیکھ رہا ہے....... جلدی سے ناشتہ دان کھول۔
پہلے اس فرض سے سُبکدوش ہو لیا جائے!"
ثروت نے ناشتہ دان کے ڈونگے نکال نکال کر سیٹ پر لگانا شروع
کر دیئے اور میں نے جلدی سے تھرموس کھولکر دو گلاس پانی بنا ڈالا۔
آپ خیال فرمائیں کس قدر تکلف کیا گیا تھا ہم لوگوں کیلئے! مسافر
نوازی کی انتہا تھی بس۔
"مرغ مسلّم، پراٹھے، شامی کباب، قیمہ، انڈوں کا خاگینہ، روغنی ٹکیاں
مٹھائی پوری ...... اور نورتن چٹنی۔
"بھیا بے زبان" کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے کہا آنکھیں پھاڑ کر
کیا دیکھ رہے ہو۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔
غور تو فرمائیے۔ ہم لوگ تھے تو انسان ہی! دونوں نے ملکر کھانا شروع کیا
لیکن کہاں تک کھاتے ان کی نانی کو۔
بہرحال کوشش کی اور پنڈوں کی طرح خوب ڈٹ کر کھایا۔ دل میں
سوچ لیا تھا۔ کہ چاہے جیا بھلے...... رہا ہو...... چاہے جیا جائے! لیکن
اس کے باوجود بھی بچ رہا۔ اور اچھا خاصا۔ کیونکہ ابھی پھل بھی تو باقی تھے۔
ظاہر ہے کہ پھل کہاں تک چلتے۔ ڈکاریں تک تو آنا بند ہو گئی تھیں۔ پیٹ
تھا کہ "کورک ٹیپڈ" ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی کفرانِ نعمت جیسا گناہ بھی مول لینا نہیں
چاہتے تھے! چند "موسمیوں" کا عرق نچوڑ نچوڑ کر پینا ہی پڑا۔
پائخانے کے اندر سے برابر کھانسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شائد

خوش شکنی، ہنوز باقی تھی؟

ثروت پان لگانے میں استاد تھا۔ چھریرے قوام کے ساتھ پان، سفید الائچی کے ساتھ پان، تمبولین کے ساتھ پان .... زعفران اور بالائی سے بنے ہوئے چونے کے ساتھ پان......!

"بھیا بیڑا پان — میں نے کہا۔ دلی تک سفر کرنا ہے ذرا خیال رکھنا ..... راستے میں کم نہ پڑ جائیں۔"

"لکھنؤ تک کام دینگے۔"

وہ بولا۔

"شاباش استاد"

واقعی اس نے سارے پاندان کا صفایا کر دیا تھا۔

پان دان کھا کر جب اطمینان کے ساتھ میں نے "لذت نامہ" والے تکیہ پر سر رکھا تو سرور سے آنکھیں بند ہونے لگیں...... خالق خلق .... اور رب بے نیاز ..... کی قدرت کا کرشمہ نظر آنے لگا۔ ...... صدقے تیری شان کبریائی کے ...... کہاں ہمارا منہ ...... اور کجا یہ نعمات ......!

اللہ بخشے خواجہ آتش مرحوم بھی کیا خوب فرما گئے تھے۔ —

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں!

میں اسی سجدہ شکر میں محو تھا اور ثروت جمائیوں پر جمائیاں لے رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے تار بابو کوئی میسج لے رہے ہیں۔
کھٹ .... کھٹ ...... کھٹا کھٹ ۔ کھٹ۔

آوازیں بے تکان آرہی تھیں۔ غور جو کیا..... تو معلوم ہوا کہ بات نہیں ہے
پاخانہ کا دروازہ اندر سے کھولا جا رہا ہے!..... مگر وہ کمبخت جنبش ہی نہیں کھاتا......
...... اللہ جانے کیا معاملہ!

"حضرت، حضرت، ذری دروازہ..... کھول دیجئیگا..... !
ہانپتی ہوئی پاٹ دار آواز پاخانہ کے اندر گونجنے لگی۔

میں نے مسکرا کر ثروت کی طرف دیکھا..... اور لاپرواہی سے حقّہ کی نے
ہونٹوں میں دبالی کڑ..... لڑ..... کڑ..... ڑا..... ڑا..... کھٹ..... کھٹ.....
..... کھٹا کھٹ..... کھٹاک.....

پاخانہ پر جو ہوائی حملہ کی مشق ہو رہی تھی اس کی ناہموار آوازوں میں حقّے کی
صدائیں بھی گم ہو گئیں۔!

جناب..... ذری..... دروازہ..... آپ کو زحمت ہوگی!
اندر سے پھر آواز آئی۔

ہم لوگوں نے اس "دخل در معقولات" قسم کی سمع خراشی پر کوئی توجہ نہیں
کی۔..... حقّہ بڑے مزے میں آرہا تھا..... مگر مجبوری تو یہ تھی کہ جو سانس باہر آتی اس کا
واپس جانا مشکل تھا۔ چہ جائیکہ حقّہ کے خوشبودار گھونٹ اور..... رہ رہ کر یہ غم اور بھی
کھائے جاتا تھا کہ ہائے پھلوں کی ٹوکری بھری کی بھری ہی ہے۔

"پاخانہ" کا دروازہ انتہائی جوانمردی کے ساتھ توڑا جا رہا تھا..... مگر جناب
آخر اگر یہ ریلیں ایسی ہی "جاپانی" بنائی جاتیں تو آپ خود سوچئے۔ آج اتنی لڑائی کا ہے کو
چھڑ جاتی، بس جھگڑا تو اسی بات کا ہے۔ جاپان والے کہتے ہیں کہ ریلیں، ہوائی جہاز
موٹر، تانگے، یکّے، شکرم، بیل گاڑی، کوٹھیاں، مکانات، بنگلے، سینما وغیرہ

سب کچھ ٹین اور چیڑ کے تختوں سے بنائے جائیں اور ان کی مرمت در گوند ۔ نگا کرہوا کرے ...... اتحادیوں کی رائے ہے کہ جو کام کیا جائے ...... پائدار ہونا چاہیئے ۔ ...... روز روز کا جھگڑا ٹھیک نہیں ! اصل پوچھیئے لڑائی کی وجہ یہی ہے ورنہ .... ورنہ بات ہی کیا تھی !

تو ...... خیر ...... وہ رکھ کر زور لگ رہے تھے اور نئی نئی طرح سے "ڈائیلاگ" پکارے جا رہے تھے ۔

- اجی حضت (حضرت) ۔
- جناب والا ۔
- بابو جی ۔
- مسٹر ۔
- بابو صاحب ۔
- اجی سنیئے ۔
- ارے میاں صاحبزادے ۔
- بھائی ...... جان ۔
- اے بھیا ۔
- جناب من ۔

اور خدا جانے کیا کچھ کہ کر ہم لوگوں کی خوشامد ہو رہی تھی ...... مگر .... ہم کہاں کے ایسے گئے گذرے تھے جو آ جاتے ان کے جھانسے میں ! ہم بڑی مشکل سے تو پھنسے تھے بچا ۔ تب اور کھول دیتا دروازہ ۔ جیتا بند بان نے چپکے سے پوچھا ۔ "اب کھول نہ دیا جائے ۔"

"جی..... بہت خوب! معلوم ہوتا ہے چنیا کھجلا رہی ہے"

میں نے جواب دیا وہ خاموش ہو گیا۔

اب گاڑی کی رفتار میں کچھ کچھ آہستگی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی!

چند ہی منٹ میں پوری ٹرین کی ٹرین پلیٹ فارم کے پہلو میں بل کھاتی ہوئی پہنچ گئی! اور قلیوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ...... بڑے میاں نے پائخانے کی کھڑکی سے پلیٹ فارم کی طرف تھوتنی نکالدی!

قلی جا رہا تھا۔

قلی...... او...... قلی والے ___!

مڑ کر دیکھا قلی نے! اتنے موٹے آدمی کا سامان بھی ایسا ہی ڈیل ہو گا۔ غالباً۔؟

"بھائی...... ذرا..... پائخانہ بند ہو گیا۔ کھولدینا..... میاں!"

منہ بسور کر رونی شکل بنا دی۔

آدمی تھا قلی بھی! ایک ذی روح پر مصیبت دیکھ کر اس کا دل پگھل گیا۔ کھڑکی کھول کر اندر آیا ہی چاہتا تھا کہ میں نے للکارا ___؟

"ابے...... وا ہی ہوا ہے! چل اپنا کام کر..... اتنی مشکلوں سے تو ہم دونوں نے ملکر بند کیا ہے..... اگر..... ان کی طبیعت اچھی ہوتی تو بند کا ہیکو کئے جاتے!

میں نے معاملہ کی نزاکت سمجھا دی۔ اس نے منہ پھیر کر دیکھا بھی نہیں۔ بھاگا جی لیکر اپنا۔

پلیٹ فارم ہی تو تھا۔ کئی آدمی نکل گئے۔ بعض نے دیکھا اور بعض نے نہیں! ایک دو نے دیکھکر بھی منہ پھیر لیا..... آخر ایک انسان نما بابو جی کو ان سے

ہمدردی پیدا ہی ہو گئی۔ قریب تھا کہ وہ انٹر کلاس میں آکر " جانگلوش " کو کھولدیں۔

" ارے . . . رے...... رے ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں ! میں سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ ماموں جان کو دورہ ہو گیا ہے..... آگرے پہچانا مشکل ہو جائے گا مشکل ہے بابو جی !

وہ بیچارے سٹ پٹا گئے ! ان کا ہاتھ رُک گیا۔

آپ کے ماموں ہیں...... کوٹھا اتر گیا ہے میرے خیال میں !

آہستہ سے بولے۔

" جی ہاں...... اسی لئے تو کہہ رہا ہوں ..... ورنہ کون اپنے ماموں جان کو پائخانہ میں بند کر دیتا۔ بھلا ! "

میں سنجیدہ ہو کر عرض کیا !

" پاخانے " کی کھڑکی کے پاس ہی یہ بات چیت ہو رہی تھی..... شاید انہوں نے سن لی

" صاحب کہنے دیجئے...... ان بدمعاشوں کو ..... میں ہرگز ان کا ماموں نہیں ہوں۔

اندر سے بولے۔

میں نے بابو جی کو نوٹ کرا دیا۔

" اب دیکھئے ! ان کی باتیں..... جیسے ماموں کہیں سے بن کر آتے ہیں ! کہتے ہیں میں ان کا ماموں نہیں !

چٹخے ہوئے شیشوں کی عینک سے بابو جی نے جھانکا ! اور جھینپ سے پیٹ تھام کر کی طرف سدھارنے لگے !

"بچے ... بچے ..... بچے یہ مرض بڑا کتا ہوتا ہے بچے پاگل سب ہو جاتے ہیں!"

میں پاگل نہیں ہوں ..... بدمعاشو! ..... میں تمہارا ماموں نہیں ہوں ہرگز نہیں! ..... یہ چور ہیں ..... شریر ..... لچّے ..... بند کر دیا ہے مجھکو ..... میرا دماغ ٹھیک ہے ..... یہی پاگل ہیں ..... میں ان کا ماموں ہرگز نہیں ..... ہرگز نہیں! خدا کی قسم نہیں! میں تو آگرے اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔

آدھ گھنٹہ سے زیادہ دیر تک پائخانہ میں بے بسی کیسا تھ پھڑ پھڑاتے پھڑ پھڑاتے وہ سچ مچ پاگل ہو گئے تھے۔ پسینے میں شرابور ..... اور منہ سے کف جاری تھا چیخ رہے تھے بدستور۔

میرے ڈبے کے سامنے اچھا خاصا مجمع تھا۔ اور ان کی چیخ و پکار سے سارا پلیٹ فارم گونج رہا تھا۔ کچھ لوگ ہنس رہے تھے کچھ افسوس کر رہے تھے ..... اور کچھ خیال آرائیوں میں محو!

"ایشور ..... موت دیدے ..... مگر پاگل نہ کرے"

"ہاں صاحب بڑا موذی مرض ہے کمبخت!"

"آگرے لیجا رہے ہوں گے یہ لڑکے؟"

"کب سے بیمار ہیں!"

مارنے کو نہیں دوڑتے!

"آپ کے حقیقی ماموں ہیں ..... تا ....؟

"پہلی مرتبہ دورہ پڑا ہے ..... شاید ....؟

"دکھیا ..... دکھیا کا کوٹھا تڑیا ہے! "

"قبلہ" چیختے چیختے گالیوں پر اتر آئے تھے۔ نگران کی اس سراسیمگی و بدحواسی سے میری جیت پر جیت ہو رہی تھی...... لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ بیانات بھی دینا ہی پڑے:

"جی.. بالکل حقیقی ماموں ہیں!"

"پچھلے سال بریلی میں رکھا تھا دو مہینے! کچھ فائدہ نہیں ہوا۔"

"بیمار تو بہت دنوں سے ہیں...... لیکن اب کے ذرا سخت حملہ ہوا ہے....."

".... مارنے کو.... دوڑتے ہیں۔ کاٹ کھاتے ہیں۔"

"ادھر بڑے میاں نے اپنی صفائی کیلئے لوٹا و کھایا۔ میں تو پاخانے آیا تھا...... بند کر دیا......"

"دیکھئے صاحب...... میں نہیں جانتا جو لوٹا کھینچ ماریں۔"

پبلک پر میرے اس کہنے کا کافی اثر ہوا۔ لوگ ہمت کیا فاصلے سے کھڑے ہو گئے۔ اور...... اور حضرت نے زیادہ موٹی قسم کی برہنہ گالیاں شروع کر دیں!

وہ جتنا بھی چیخ رہے تھے اتنا ہی ان کی دیوانگی کا یقین سب کو ہوتا جا رہا تھا۔

مسافر سمٹ سمٹا کر اپنے درجوں میں چلے گئے ...... اور گاڑی روانہ ہو گئی! مگر ان کے غصہ اور گھبراہٹ کا ٹمپریچر...... بڑھتا ہی جا رہا تھا...... اور باقاعدہ...... گالیاں دے رہے تھے...... بدستور!

"زنجیر کھینچ لوں گا...... ورنہ کھولو...... !"

دھمکی دی پاخانہ میں سے:

"ماموں ذات۔ اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے:"

میں نے کہا!

ثروت بولا.....

"پان ... تو نوش فرمائیے گا ..... ماموں جان !"

" ارے بے ایمانو ..... پان کھا لئے سب ! ..... ہائے خدا غارت کرے ..... ! دیکھو ابھی ٹرین رُکوا کر ..... تم سب کو ..... پولیس کے حوالے کرتا ہوں ۔

سچ مچ زنجیر کھینچ لی ..... اور گاڑی رُک گئی ..... ہانپتے ہوئے گارڈ صاحب چلے آ رہے تھے !

" گارڈ صاحب ..... یہی بدمعاش ہیں ..... مجھکو پاخانے میں بند کر دیا میرے سب پان کھا لئے ! گرفتار کر لیجئے ان کو ..... بدمعاش ..... چور ہیں !

" براہِ کرم ..... گارڈ صاحب کنکشن الگ کر دیجئے ..... ورنہ یہ راستے بھر یہی کرینگے ! آگرے پہونچنا مشکل ہو جائیگا ..... !

" میرے ماموں ہیں ..... صاحب دماغ میں کچھ فتور ..... آگیا ہے ! علاج کیلئے لئے جا رہا ہوں !"

اندر سے بڑے میاں جھنجلا جھنجلا کر تردید کر رہے تھے ....

جھوٹے ہیں ..... بدمعاش ! ابے تیرے ماموں ..... کی ..... !

نہ جانے کیا اُول جلول بک رہے تھے ! ان کی گھبراہٹوں نے بہت ہی جلد گارڈ کو بھی یقین دلا دیا کہ زنجیر پاگل پن ہی میں کھینچی گئی ....

وہ ..... اپنے ڈبہ کی طرف چلا گیا اور گاڑی پھر روانہ ہو گئی !

" ماموں ذات " آپ کے زنجیر کھینچنے سے کیا فائدہ ہوا ..... اب آپ کھینچتے رہیئے زنجیریں ..... ٹرین رُک ہی نہیں سکتی ..... کنکشن ..... ہی علیحدہ ہو گیا ۔

میں نے پاخانہ کے دروازہ پر دستک دیکر عرض کیا ..... !

کیا معقول جواب دیتے ہیں.....!

" میں..... تیرا..... ماموں نہیں..... باپ ہوں "

" غالباً شرم تو نہ آئی ہوگی آپ کو..... ماموں سے باپ بن رہے ہیں!

میں نے جواب دیا.....!

بولے!

آخر..... میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے..... جو مجھے تنگ

کر رہے ہو!"

میں نے کہا:-

" آخر..... ہم لوگوں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا..... جو پان کو بھی نہ پوچھا!

حقہ تک نہ بڑھایا۔ ناشتہ گول کر گئے اپنے ڈبے کا ڈبہ چھپا رکھا تھا آپ نے.....

..... آپ نے یہ بھی تو نہ فرمائی کہ یہ لوگ جو آئے ہیں اس ڈیپارٹمنٹ میں انکو بھی بیٹھنے

کا حق ہے..... آخر کیا بگاڑا تھا آپ کا ہم لوگوں نے..... اس بدتہذیبی..... اور

بداخلاقی کی کوئی حد بھی ہے!"

ندامت تو ان کو خاک محسوس ہوتی..... لیکن اپنی جان بچانے کی فکر

ضرور تھی:-

" بیشک یہ میری غلطی تھی..... آپ لوگ میرے چھوٹے ہیں معاف کر دیجئے

ناشتہ پھل بھائی سب وہیں رکھا ہے..... بسم اللہ شوق سے کھائیے آپ ہی

کا ہے!"

" بڑے میاں کے لہجے میں بھی تبدیلی ہو گئی۔

خیر..... شکریہ! اس کی فکر آپ نہ کریں..... اس قسم کے ضروری

کاموں سے تو ہم لوگ پہلے ہی فرصت کر چلے ...... آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ .... اور بہت بہت شکریہ!

"ٹونڈلہ" کا اسٹیشن آچکا تھا۔ ثروت نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹیچی میں رکھے! جیسے ہی گاڑی ٹھہری ہم لوگ پلیٹ فارم .... کی دوسری طرف اتر کر دلی جانیوالی ٹرین میں بیٹھ چکے تھے .... اور ہماری ٹرین آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔

جہاں بات بنائے نہ بنے

ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی ؛ سچ پوچھیے تو آپا اور مجھ میں فرق ہی کیا تھا! ایک درخت کی دو شاخیں، ایک ماں کی دو اولادیں۔ جیسے بدن کی انگوٹھی پر آنکھوں کے دو نگینے۔ یہ اور بات تھی کہ میرا رنگ آپا سے کچھ کھلتا ہوا تھا۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہ تھے، کہ اللہ نہ کرے آپا کوئی ایسی کالی کلوٹی تھیں جن پر "بلیک آؤٹ" ہونے کا گمان کیا جائے۔ بس ذرا ڈوبتا ہوا سا گیہواں رنگ، بھاری بھر کم ڈیل ڈول اور چہرے پر ہلکے ہلکے داغ تھے۔ سو وہ بھی چیچک کے۔ لیکن اس دنیا میں ظاہری رنگ روپ دیکھنے والے تو بس یہ چاہتے ہیں کہ بدصورت لڑکیاں زندہ جان ہی قبر میں سلا دی جائیں۔ بے قطع سے بے قطع بدصورت سے بدصورت احمق چغد مردوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر تو نظر نہیں آتا، مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتا ہے۔ آئینہ لے کر اپنا کولتار بھرا ہوا چہرہ نہیں دیکھتے لیکن اچھی سے اچھی نک سک کی لڑکی میں ہندی کی چندی نکالتے ہیں۔

پہلے پہل جب ہم لوگوں کے پیام آئے تو ہر طرف سے میرے ہی بڑے زور ہونے

لگے بعض نے کھلم کھلا بعض نے خوبصورتی کے ساتھ آپا میں عیب نکال کر یہی کہا کہ کوئی وڈی سے کر دیجیے۔ امی جان کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور ہونی بھی چاہیئے تھی جب تک بڑی بیٹی کا فرض ادا نہ کر لیتیں ان کو دنیا کیا کہتی پھر خدا جانے آپا کے بیاہ میں کیسی کیسی اڑچنیں لگتیں۔ ایک تو یوں ہی آپا میں سب عیب نکالتے تھے۔ اللہ جانے جب کیا کیا برائیاں نکالی جاتیں۔ زمانہ یہی کہتا کہ اگر یہ ایسی ہی ہوتیں تو کاہے کو یہ ہوتا کہ بڑی بیٹھی ہیں اور چھوٹی کا بیاہ ہو جائے۔

ابا جان ٹھہرے نئی روشنی کے! انہیں اس قسم کی دقیانوسی باتوں سے اللہ واسطے کا بیر۔ آئے دن امی جان سے یہی جھگڑتے کہ میں ان پرانی باتوں کو جہالت سمجھتا ہوں اس میں کیا جب ماشاءاللہ دونوں لڑکیاں بیاہنے کے قابل ہیں تو اس کا پہلے ہوا تو کیا ـــ اور اس کا ہوا تو کیا ـــ بیاہ تو دولھا ہی کا کرنا ہے۔ اس میں آگے پیچھے کا سوال ہی کیا ـــ امی جان رہ رہ کر سمجھاتیں مگر وہاں ایک نہیں ہزار نہیں۔ اِدھر میری ـــ سسرال والوں نے ابا جان کی شہ پاتے ہی تقاضوں کی بھرمار کر دی۔ روز روز یہی ہونے لگا کہ اب صاحب دن تاریخ مقرر ہونا چاہیئے۔ دیر نہ ہونی چاہیئے۔!

امی جان نے تو پہلے ہی دن لکڑدں کوں کا ڈربہ پھونک دیا ہوتا مگر ابا جان نے ان لوگوں کو شہ دے کر اتنا سر چڑھالیا تھا کہ اب امی جان بھی ہمت ہار چکی تھیں۔ اُدھر آئے دن کے تقاضے، اِدھر کی ٹال مٹول! کوئی سال بھر تک یہی ہوتا رہا۔ مجھے بھی اب بیسواں برس لگ چکا تھا، اور بیچاری آپا کو تو اکیسواں بھر کے بائیسواں شروع تھا۔ آخر ہوتے ہوتے ایک چپ چپاتی شام میں میرا نکاح اس شرط کے ساتھ کر دیا گیا کہ میری رخصتی اور آپا کی رخصتی ساتھ ہی ساتھ ہوگی۔

اس قسم کے شادی بیاہ سچ پوچھیئے تو "گھر گھوڑا نخاس مول" کہلاتی ہیں

کبھی بنو تو پڑی میکے میں ایڑیاں رگڑ رہی ہیں اور میاں ادھر ادھر واہی تواہی گلیوں کے چکر
کاٹ رہے ہیں۔ ان زندہ درگور لڑکیوں کا بھائی برادری میں جانا تو درکنار گھونگھٹ کی
آڑ سے کسی باہری عورت کو دیکھ لینا گناہ اور گناہِ عظیم سے کم نہیں ہے۔ دن ہے تو کمرہ، رات ہے
تو کمرہ۔ جاڑے، گرمی، برسات۔ بارہوں مہینے یہی قید خانہ ہے۔ اور یہ۔ یہیں کھانا یہیں
پینا۔ یہیں سونا، یہیں جاگنا۔ بس ایک زندہ جان ہے جو یہیں گھٹتی ہیں۔ نہ زندگی کے
دن کاٹے کٹتے ہیں نہ موت آتی ہے۔

میرے نکاح کے بعد صبا کا امی جان کو خیال تھا ہی ہوا۔ آپا کے پیام آنا بند
ہو گئے۔ اور ایک آدھ جو آئے بھی تو وہ ایسے نہ تھے جن پر منظور کیا جاتا۔ کہیں حسب نسب
کے ہیٹے۔ کہیں چال چلن کے کھوٹے۔ کوئی بڈھا ڈھڈھا کسی کے پاس بی۔ اے
کا ہے پڑھا لکھا کا بھی سرٹیفکیٹ نہیں۔ اور کوئی نکھٹو بے روزگار۔ اب آپا ایسی بھی بھاری نہ
تھیں جن کو وہ آپ جان بوجھ کر کسی گڑھے میں دھکیل دیتے۔ امی جان کو دن رات
یہ غم گھلائے دیتا۔ ابا جان اسی سوچ میں سوکھ کر کانٹا ہوئے تھے۔ ٹہلا کرتے۔ بےشمار
اخباروں میں شادی کے اشتہار چھپوائے۔ ان گنت شادی بیاہ کرنے والی کمیٹیوں کے
ممبر بنے۔ سیکڑوں دوستوں کو خطوط لکھے۔ عزیز و اقارب سے کہا۔ دان جہیز کا لالچ دیا۔
لیکن حسب دلخواہ کوئی رشتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اول تو پیام ہی نہ آتے اور جو آتے بھی تو کہیں
سے تصویر بصیغۂ راز مانگی جاتی۔ کوئی کہتا پہلے لڑکی دکھا دیجئے۔ کسی کو کورٹ شپ
پر اصرار۔ کہیں یہ شرط کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھائیے۔ غرضکہ ایک عذاب میں جان
تھی۔ شادی کا ہے کو تھی بیچاری آپا کے سہرے کے پھول نہ اب کھلنے تھے نہ جب
نئی روشنی کی نئی نئی شرطیں۔ امی جان تو امی جان ابا جان کو بھی منظور نہ تھیں۔
نت نئے فیشن کی رٹ لگائے رہتے۔ لڑکی حد سے پڑھی تو جان رہی تھے۔ ان کا خیال

تھا تو اس بات کا کہیں ابا کو دیکھ کر لڑکے والے انکار نہ کر دیں۔ امی جان پھوٹتے تھنوں بیزار
تھیں کہ چاہے بیاہ ہو نہ ہو میں نکاح سے پہلے لڑکی کا سایہ بھی نہ دکھاؤں گی چاہے جنم
زندگی میری مہرن یوں ہی بیٹھے رہے۔ یہ تو باوا دادا میں نہیں ہوا۔ میں کوئی نئی بات
اپنے جیتے جی نہ ہونے دوں گی۔ اپنی جان دے دوں گی، مگر یہ تو کسی طرح نہ ہوگا۔ بھاڑ
میں جائے موا فیشن آگ لگے اس نئی روشنی کو، کنواری باری لڑکی مجھ سے تو نہ دکھائی
جائے گی۔ نکاح سے پہلے۔ ہاں عزت آبرو کے ساتھ لڑکی سسرال چلی جائے۔ میاں سر کو لے
پھرائیں چاہے۔ دشمنوں کو تھو تھو پہنچائیں۔ زمین آسمان ایک کردوں گی مگر اپنی آنکھوں
تلے یہ نہ ہونے دوں گی۔ ابا جان کہتے، بیگم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری تو وہی مثل
ہے کہ، سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ کہیں سے شادی بیاہ طے بھی ہونے
دو پھر سب کچھ کہہ لینا۔ جی میں آئے لڑکی دکھانا، جی میں نہ آئے نہ دکھانا۔ ابھی سے
ایسی باتیں کر کے سارے جہان کے کان کھول رہی ہو کہ ہو نہ ہو لڑکی میں کوئی عیب ضرور
ہے جبھی تو دکھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ بڑی سعی و سفارشوں سے اللہ اللہ
کر کے ایک جگہ سے پیام و سلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ لڑکا پولیس میں تھانیدار تھا
دوہاجو تو ضرور تھا۔ مگر شادی کے تین ہی چار مہینے کے بعد بیوی مر گئی تھی۔ کوئی بال
بچہ بھی نہیں تھا حسب نسب، چال چلن، اور طور طریقے بھی ایسے تھے جن پر سارے
گھر کو اطمینان تھا۔ مگر ان کی شرط بھی یہی تھی کہ پہلے لڑکی دیکھیں گے۔ ابا جان نے
ان سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ ہاں لڑکی دکھا دی جائے گی۔ لیکن امی جان نے جو سنا
تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ وہ چیخم دھاڑ رونا دھونا کہ اللہ تیری پناہ
ابا جان کے پیچھے اس بری طرح پانچے جھاڑ کر پڑیں کہ ان کی آئی گئی عقل جاتی رہی۔
گھر بھر میں دو دن تک یہی طوفان برپا رہا۔ چار پہر سارے گھر میں کسی کے منہ پر کھیل

تک پہنچ گئی۔ امی جان کا رونا دیکھ دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا۔ ان کی باتیں سن سن کر میرا کلیجہ بیٹھا جانے لگتا۔ پورے دو دن ابا جان حویلی سے باہر نہیں نکلے بارے تیسرے دن جو آئے بھی تو امی جان سے یہی کہا کہ بیگم اب میری عزت اور لاج تمہارے ہاتھ ہے اگر تم رکھو تو یہ رہے، ورنہ ناک تو کٹ ہی چکی جب میری بیوی نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ دنیا میں میرا ٹھکانا نہیں۔ دو دن سے میں اسی سوچ میں ہوں کہ کیا کیا جائے۔ ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے اگر تمہیں پسند آئے تو مانو ورنہ جانے دو۔ میرے خیال میں تو مہرالنسا کو دلہا دیا جائے اس کا نکاح بھی ہو چکا ہے مہرالنسا کے دولہا کی محرم بھی ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ امی جان اس پر بھی رضامند نہیں ہوئیں کہنے لگیں، یہ دھوکے فریب کی باتیں مجھے پسند نہیں ....

.... مختصر یہ کہ کئی دن کی کد و کاوش کے بعد ابا جان کی تجویز منظور ہو گئی۔ اور تھانیدار صاحب کے گھر والوں کو اس کی اطلاع بھی دیدی گئی۔

ہفتہ عشرہ کے بعد ہی ان کے گھر کی عورتیں اور مرد آ گئے۔ امی جان اور خالہ بی نے مجھے خوب بنا سنوار کر آپا کے انٹرویو میں پیش کر دیا۔ اور میں پسند بھی کر لی گئی اسی دن تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور یہ لوگ واپس چلے گئے۔

اب اس طرف کی سنیئے! میری سسرال والوں نے رخصتی کے لئے تقاضا کیا۔ ابا جان اور امی جان میں کئی دن سے مسلسل مشورہ اور صلاح کے بعد طے پایا کہ ان لوگوں کو لکھ دیا جائے کہ ایسے گرانی کے زمانہ میں دو کام ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہے تو دو چار مہینے کے بعد بدرالنسا کی رخصتی کر دی جائیگی۔ اس سلسلہ میں کئی ہفتے برابر ابا جان اور میری سسرال والوں میں خط و کتابت ہوتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ خفا ہو گئے اور صاف صاف لکھ بھیجا

کہ اب ہم لوگ کبھی رخصتی کرانے کیلئے نہیں آئیں گے۔ آپ کا جب جی چاہے لڑکی بھیج دیجئے گا۔ انہوں نے آپا کے بیاہ میں بھی آنے سے انکار کر دیا۔ یہاں آج کل اس قسم کے قصے قضیئے طے کرنے کی کس کو فرصت تھی۔ سارے گھر میں گہما گہمی سے آپا کا بیاہ رچا تھا۔ انتظامات ہو رہے تھے، دن رات سب کو اسی بیاہ کی فکر تھی۔ امی جان نے تو جھنجھلا کر یہاں تک کہہ دیا۔ میری جوتی سے بیاہ میں نہ آئیں گے یہ لوگ تو کیا میری بیٹی کا بیاہ نہ ہوگا۔ جہاں مرغا نہ ہوگا وہاں کیا سویرا ہی نہ ہوگا۔ آج کل سارے گھر میں چرچے تھے کہ اللہ پلک جھپکتے ہی وہ گھڑی آجائے جب دکھیاری بہن کے سہرے کے پھول کھل جائیں۔ ماں باپ کے سایہ میں پروان چڑھے لڑکی۔ صدا سکھ سہاگ سے رہے پھلے پھولے شاد آباد رہے۔

خوشی اور مسرت کی گھڑیاں دوپہر ڈھلے کی چھاؤں ہوتی ہیں ادھر آنکھ بند کی ادھر شام ہو گئی۔ آپا کے بیاہ کی تاریخ بھی اسی طرح گھوڑے کی دوڑ دوڑتی ہوئی آگئی۔

بھیتر سے باہر تک عجب گہما گہمی کا عالم تھا، کان پڑی آواز سنائی نہ پڑتی جسے دیکھو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے ہے۔ وہ نفسی نفسی کہ الاماں و الحفیظ۔ میراثنیں اور ڈومنیاں ایک طرف اپنی بیوقت کی راگنیاں اڑا رہی تھیں ٹولی ٹولی میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اپنی قسمت کا الگ رونا رو رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں دوسری طرف اپنی جوانی کے قصے دہرا رہی تھیں۔ باہر شہنائی، ارگن، ڈھول دھماما۔ ایک ہنگامہ تھا۔ ادھر آپا قیمتی شاہی جوڑا پہنے ہوئے دلھن بنی بیٹھی تھیں اور چاروں طرف ہمجولیوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سکھی سہیلیوں کیلئے یہ تماشہ بالکل نیا تھا کہ ایک دولھا کیلئے دو دلھنیں تیار ہیں۔ ہر طرف سے ہم دونوں پر چٹکیوں

کردی۔ کبھی گال میں چٹکی لے لی۔ کسی نے گدگدا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر یہی ہوتا رہا۔ یکایک دولہا
کے اندر آنے کی دھوم مچ گئی۔ چھپنے والی عورتیں اور لڑکیاں کوٹھریوں اور کمروں میں چھپ
گئیں۔ ڈیوڑھی کے دروازہ سے بہنوں نے دولہا کے سر پر آنچل ڈالا۔ اور جس کمرے
میں میں بیٹھی ہوئی تھی وہاں لے آئیں۔ امی جان نے دولہا کی بلائیں لیں اور دیر تک
دعائیں دیتی رہیں۔ ایک عورت نے میرا گھونگھٹ اٹھا کر دولہا کو دکھاتے ہوئے کہا۔
"کہو بیوی آنکھیں کھولو ...... میں تمہارا غلام۔" داروغہ جی بھی تھے بڑے چلتے ہوئے
کہنے لگے "بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا گلاب۔" سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے
کنکھیوں سے تھانیدار صاحب کو جو دیکھا تو مجھے گھور رہے تھے۔ آرسی مصحف کی
رسم ادا ہونے کے بعد تھوڑی دیر تک کچھ اور رسمیں ہوتی رہیں۔ اور دولہا میاں
باہر چلے گئے۔

دولہا کے باہر جاتے ہی رخصتی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ آپا کی ساس اور نندیں
چاروں طرف سے مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک طرف کوٹھری میں آپا کو رخصتی کے
لئے سنوارا جا رہا تھا۔ تو باہر دکھانے کیلئے میں بھی سنواری جا رہی تھی۔ ابھی دلہن
کا بناؤ سنگھار ختم بھی نہ ہوا تھا کہ باہر سے آوازیں آنے لگیں۔ گاڑی کا وقت جا رہا ہے
جلدی کیجئے دیر ہو رہی ہے۔ آپا کی ساس اور نندیں باڈی گارڈ کے دستے کی طرح چاروں
طرف تنی ہوئی تھیں اور دلہن کی رخصتی کا وقت قریب تھا۔ یہ وقت نہایت ہی نازک
تھا۔ امی جان اور خالہ بی گھبرائی ہوئی تھیں اور کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح کچھ
دیر کے لئے رخصتی ٹل جائے کسی تدبیر سے دلہن بدل دی جائے۔ ادھر آپا کے سسرال
والے تھے کہ بری طرح مجھ سے چمٹے تھے۔ میرا برا حال تھا کہ یا اللہ اب کیا ہوگا۔ دل بیٹھے
سے لگ رہے تھے ــــ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب

کی عقلیں جواب دے چکی تھیں۔ سب بدحواس باختہ نظر آرہے تھے۔

دلھن کی رخصتی کے وقت یوں تو عام طور پر رونا دھونا ہوتا ہی ہے لیکن یہاں عجیب عالم تھا۔ رونا تھا اور قیامت کا رونا حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہا تھا۔ کئی بار ابا جان نے ڈیوڑھی میں آکر بات چیت کی لیکن سب بے سود۔ پالکی لگ چکی تھی۔ روئی ہوئی آوازیں میں خدا حافظ کہا جا رہا تھا۔ میں آپا کی ساس نندوں کے مجمع میں خود آپا کے بجائے سسرال رخصت ہو جا رہی تھی اور سب دم بخود تھے۔ گویا یہی وہ وقت تھا کہ :-

• جہاں بات بنائے نہ بنے •

نوکر نہیں ملتے

"میں نے کہا کیا موئے یہ سب نوکر بھی لڑائی پر بھیج دیئے گئے......؟"

میرے منہ میں دبی ہوئی حقہ کی نہال چھوٹ گئی یکایک! بیگم ہی تھیں شاید ریڈیو کیلئے کسی "ٹاک" کی "ریہرسل" کر رہی تھیں ——!

"موئی یہ لڑائی نہ ہوئی عذاب جان ہو گئی۔ جس شے کو پوچھئے مہنگی ہے لڑائی کی وجہ سے!! اسے موئی اس "چوہی بٹی" کی کون سی بساط۔ ایک پیسہ میں اتنی مل جاتی تھی کہ سات سات آٹھ آٹھ جمعراتوں کے لئے کافی! اب وہ بھی ایک آنہ کی پڑیہ۔ میں کہتی ہوں کہ کیا یہ بھی لڑائی پر جاتی ہے! اللہ تیری پناہ زندگی اجیرن ہو گئی ہے زندگی.........——!

میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں آپ! آپ ہی سے کہہ رہی ہوں!

بیگم کا روئے سخن ایکدم سے "ڈائرکٹ" ہو گیا میری طرف!

آپ کو تو کسی بات کی فکر ہی نہیں —— وہ جو شیخانی ہیں آپ کی.... چہیتی —— دلاری! جواب دے رہی ہیں کہ بیوی اِن بیٹھ بیساکھ میں مجھ سے چولہا ہانڈی نہ ہو سکیگا۔ ایک تو ان کا دل اسی دن —— اچاٹ ہے جب سے میں نے رمضانی کو نکال دیا۔ جس پہ بی شیخانی کو بڑھبس لگا تھا —— اور اب تو گویا ایک کھیڑ

والی بات ہی ہے کہ گرمیوں میں ان سے باورچی خانے کا کام سنبھل نہیں سکتا۔ پھر ایمان
کی بات یہ ہے کہ ——— شیجانی کا پیٹ پیچھا ہے: وہ بہت سی جوانوں سے بڑھ کر ہی
کام کرتی ہیں۔ سارے گھر کا کھانا دانہ آنے گئے کی خاطر مدارات، بچوں کی دیکھ بھال،
سبھی کچھ تو ان کے سر ہے اور وہ بیچاری اُف نہیں کرتیں ——— اور
——— آپ ہیں کہ کان پہ جوں بھی نہیں رینگتی۔ جب آدمی کیلئے کہتی ہوں آپ کا پاس صرف
ایک ہی جواب ہے کہ لڑائی کی وجہ سے نوکر نہیں ملتے۔ یہ بالکل انوکھی بات ہے گیا
نوکر بھی لڑائی پر بھیج دیئے جاتے ہیں؟ اصل تو یہ ہے کہ آپ کو کچھ فکر ہی نہیں۔ ڈھونڈنے
سے تو خدا بھی مل جاتا ہے نوکر تو نوکر ہیں۔"

میں سر کھجا کر سوچنے لگا آخر بیگم اس وقت کہنا کیا چاہتی تھیں ——— لیکن جاننا بعد
کو ان سے بحث کرنا فضول، بیکار، بے سود، سمجھتا ہوں تو وہ بھی وہی عورت ذات جس کو
دنیا ناقص العقل سمجھ چکی ہے۔ اب رہا نوکر کا سوال تو یہ کہنا کہ ڈھونڈنے سے خدا مل جاتا ہے
——— تو یہ واقعہ ہے کہ اس لڑائی کے زمانہ میں ممکن ہے بہت تلاش و جستجو کے بعد
کہیں خدا مل جائے لیکن نوکر نہیں ملتے۔ میں نے کیا کیا کوششیں نہیں کیں ———
——— [illegible] نوکر [illegible] ہوتے [illegible]
بیگا [illegible] ہیں لیکن [illegible] کے دو [illegible] میں سو سے آئی۔ سی۔ ایس۔ پی۔ سی
[illegible] کمیشن [illegible] کوئی [illegible]
[illegible] زیادہ مصیبت یہ تھی کہ شیجانی کی وجہ سے نوکروں کو ٹھہرنا [illegible]
[illegible] عاشق مزاج واقع ہوئی تھیں [illegible] آیا
——— [illegible] نے پیام دے [illegible] اپنے نکاح کیلئے ——— !
اب آپ ہی غور فرمائیے، نوکر ٹھہرتے تو کیسے! اس پر طرہ یہ کہ بقول بیگم کے شیجانی

میری چہیتی اور دلاری تھیں۔!

ببیں تفاوت راست کجا ست تا بہ کجا!

دفتر سے واپسی کے بعد اب یہی ہونے لگا ——— کہ کم از کم روزانہ میں نوکر کی تلاش میں چکر لگاتا! احباب اور ملنے والے بھی عاجز تھے کہ میرے پاس سوائے نوکر کے اور کوئی دوسرا موضوع باقی نہ رہ گیا تھا!

"بھائی ظہور اگر تمھاری طرف کوئی نوکر ہو تو اطلاع دینا"

"اجی مولانا ——— آپ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک نوکر ہی دلوا دیں گے!"

"بھائی صاحب خیال رکھیئے گا، مجھے نوکر کے بغیر سخت تکلیف ہے۔"

"تنخواہ جو فرمایئے گا دیدی جائیگی لیکن نوکر جلد ملجائے بہت جلد!"

"جہاں تک بڈھا آدمی ہو اچھا ہے"

حقیقت میں میں گھبراتا تھا کہ اگر کوئی جوان آدمی آگیا تو شیخانی کا بوڑھا مگر پرشباب دل کسی طرح روکے نہ رُک سکے گا۔ اور ہمارا گھر اچھا خاصا "وادیٔ نجد" بن جائیگا۔ غور تو فرمایئے کہ شیخانی کی عمر پچاس سے کچھ اوپر پہونچ چکی تھی اور صورت و شکل تو بس ——— کچھ پوچھئے نہیں۔ یعنی ان میں عورت ہونے کے کوئی آثار قدیمہ باقی نہ رہے تھے۔ بجز اس کے کہ ان کے سینہ میں بالکل بائیں طرف جہاں پر یہ ڈاکٹر لوگ اسٹھسکوپ لگا کر دیکھتے ہیں ——— ایک دل ضرور تھا اور وہ بھی نہایت ذوق طلب نوجوانی کے خیال میں ڈوبا ہوا ——— اور بس؟ لیکن ہم لوگوں کے سامنے سب سے بڑی دشواری اور مجبوری جو تھی وہ یہ کہ ہمارے اور بیگم کے مشترکہ بچوں کی وہ کھلائی رہ چکی تھیں۔ حالانکہ بیگم کے نزدیک شیخانی کے ان تمام احسانات کا بار تنہا میری ہی گردن پر تھا

دوستوں اور ملنے والوں کی کوششوں سے دو چار نوکروں کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا وہ حقیقتاً ایسے شرائط تھے کہ میں اپنی بیگم کو طلاق دیکر اور نصف درجن کے غریب بچوں کو عاق کر کے بھی ان "شہکار جیات" کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ جن کے نزدیک میری تمام تنخواہ معہ گرانی الاؤنس کے ان کی ضروریاتِ زندگی کیلئے ناکافی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک معمولی تنخواہ کا آدمی کسی طرح اتنا بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ گھر پہ گھستے ہی بیگم "نوکرنامہ" چھیڑ دیتیں۔ اُدھر دوست احباب کے نزدیک مجھے سخت "نوکر کا مراق" ہو گیا تھا ۔۔۔ پھر سب سے زیادہ شیخانی کے نوٹس ۔۔۔!

"میاں جلدی انتظام کیجیئے نوکر کا ۔۔۔ ورنہ! .... ؟

"باورچی خانے جاتے ہی میرا سر پھٹنے لگتا ہے۔"

"بیوی یہ دس دس کام مجھ سے نہ ہو سکیں گے کہ بچوں کو بھی سنبھالوں اور چولہا ہانڈی بھی کروں۔"

"دنیا بھر کے نوکر اُڑ جائیں تو ساری دنیا کا کام کیسے چلتا ہے ....
.... میاں کو کچھ فکر ہی نہیں۔" !

"بیٹھے بٹھائے رمضانی کو نہ جانے کیا سوجھی بیچارے کو یہ چپ .... !"

شیخانی ٹھنڈی سانس بھرنے لگتیں! گویا "رمضانی" زبان پہ بار بار آیا یہ کس کا نام آیا۔

ہر چند میں نے سوچا کہ خود شیخانی سے کہہ دوں کہ اپنے شوہر ہی کو نوکر سمجھ کر رکھ لو۔ لیکن ڈرتا تھا تو اس بات سے کہ شیخانی بے حد دل جلی ہیں۔ رمضانی کا غم فراق ابھی تازہ ہے، فوراً ہی وہ کہہ دیں گی کہ رمضانی کو کیوں نہیں بلا لیتے ۔۔۔

میاں آپ! اور یہ مجھے کسی طرح پر منظور نہ تھا۔

جو کچھ بھی ہو مگر خدا لگتی تو یہی ہے کہ یہ مولانا لوگ جہاں ایک طرف خدا ڈھونڈ لیتے ہیں ــــ تو دوسری طرف کنواروں کیلئے بیویاں ــــ بے نوکروں کیلئے نوکر ــــ اور بیواؤں کیلئے شوہر ڈھونڈھنے میں بھی کافی مشاق ہوتے ہیں چنانچہ اس ایسے نازک موقعہ پر جبکہ دو ہی چار دن میں شیخانی ہم لوگوں کو داغِ مفارقت دینے والی تھیں۔ مولانا جانے کہاں سے ایک نوکر ڈھونڈھ ہی لائے۔ نوکر کیا! اچھا خاصا نگر وٹ ہٹا کٹا موٹا تازہ نوجوان جسکو دیکھ کر شیخانی تو شیخانی اچھے خاصے صبر آزما دل مچل جاتے! اور پھر تنخواہ بھی معمولی! ظاہر ہے کہ شیخانی کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا مگر ایسے نازک وقت میں اس سے اچھا نوکر ملتا بھی تو نہیں تھا؟ مولانا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے ماں باپ کوئی نہیں ہیں اور حال ہی میں مشرف بہ اسلام کیا ہے مولانا نے اسے! میرے لئے اس سے زیادہ کیا نعمت ہو سکتی تھی کہ اس کے نہ گھر نہ بار نہ بیوی نہ بچے! یہ بھی خطرہ نہیں کہ کہیں بھاگ جائیگا۔

بیگم کو جب میں یہ خوشخبری سنا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کی آڑ میں شیخانی بھی موجود تھیں! اس کا حلیہ، عمر اور مسکینی کا حال سنکر ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور ان کو پھریریاں آنے لگیں ــ میرے نظر پڑتے ہی حسبِ معمول شرما کر شیخانی نے دوپٹہ سے اپنا جھریوں دار چہرہ چھپا لیا ــــ!

دوسرے ہی دن مولانا اسے لیکر پہونچ گئے۔ معلوم ہوا کہ اس کا اسلامی نام غلام محمد رکھا ہے مولانا نے ــ رسمِ تعارف کے بعد ہم نے بیگم اور اپنی طرف سے مولانا کا شکریہ اتنے شاندار الفاظ میں ادا کر دیا کہ مولانا کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور ان کی داڑھی ہوا میں لہرانے لگی۔ بیگم نے اس سلسلہ میں مولانا کو ایک چائے بھیجی اور مٹھائی ــــ یہ

گھر کو اٹھانا پڑتے اسی لئے کہ اگر وہ ناراض ہو کر چلی گئیں تو نہ محض اتنا شفیق نوکر نہ ملے گا بلکہ ان آدھے درجن کے قریب بچوں میں سے ضرور کوئی نہ کوئی تڑپ کر جان دیدے گا ان کے پیچھے ۔۔۔!

غلامی بھی شیخانی کی شفقتوں کے دن بدن گرویدہ ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی ہانڈی میں سے بھونا بھونا گوشت نکال کر نمک چکھایا جاتا تو انہیں غلامی کو ۔۔۔ اصلی دیسی گھی ڈالا جاتا تو غلامی کی پلیٹ میں۔ ناشتہ کیلئے پکی ہوئی پوریاں پہلے ہی سے نکال لی جاتیں تو انہیں کیلئے۔ رمضانی کی خاطر مدارات بھی ہوتی تھی لیکن غلامی نے اس بُری طرح شیخانی کے دل کو گھائل کر دیا تھا کہ رمضانی سے زیادہ ان کی خاطریں ہونے لگیں۔!

بیگم اپنی آنکھوں سے اپنا گھر اجڑتے دیکھ رہی تھیں ۔۔۔ مگر لب نہ ہلا سکتیں! تھوڑے بہت واقعات میری نگاہوں کے نیچے بھی آجاتے لیکن میں بھی چپ تھا کیونکہ گھر کی انچارج تنہا بیگم تھیں۔ دوسرے اگر میں ان معاملات میں دخل دیتا تو اس کے معنی یہ تھے کہ بہت جلد مجھے دوسرے نوکر کی تلاش شروع کر دینا پڑتی۔! تھوڑے ہی دنوں میں شیخانی نے اپنے لئے غلامی کو اچھی طرح پھانس لیا تھا اور ہم لوگ اپنی نگاہوں سے وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جو نہ دیکھنا چاہیئے تھا ہم لوگوں کو لیکن سوائے صبر کے چارہ ہی کیا تھا! کبھی کبھار جب بیگم کو غصہ آجاتا تو اس خوف سے کہ مجھے دوسرا نوکر نہ تلاش کرنا پڑے! میں ان کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیتا ۔۔۔!

لوگ کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر میرا تجربہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ ہم لوگوں کی خاموشی اور چشم پوشی دن بدن خطرناک سے خطرناک صورت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ اور شیخانی کا جذبۂ عشق نہایت زوروں پر بھڑک اٹھا تھا ۔۔۔ یہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ گھر کے کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال میں بھی فرق آنے لگا ۔۔۔۔

ظاہر تھا کہ بیگم ہی کیلئے نہیں بلکہ خود میرے لئے یہ صورت ناقابل برداشت تھی۔ مگر سوال
تھا تو یہی کہ نوکر نہیں ملتے! گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والا مضمون تھا۔

ابھی دو چار ہی مہینے ہوئے تھے کہ غلامی پھر۔ غلام محمد۔ ہو گئے! پاؤں میں بس
آنے والا باشم، دھاری دار قمیص، کنٹوپ کی مارکین کا پاجامہ۔ شیخانی نے پیسہ پیسہ جوڑ کر جو کچھ
بھی جمع کیا تھا! غلام محمد پر صرف ہونے لگا۔ ورنہ خود ان کی آمدنی ظاہر تھی! خشخشے بالوں کے
بجائے اب غلام محمد نے انگریزی بال رکھ کر باقاعدہ طور پر ان میں تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا بھی
شروع کر دیا تھا — بیڑی کا بنڈل تو ہر وقت جیب ہی میں رہتا۔ ادھر شیخانی بھی بنک سکھ
سے بچھڑنے کی کوشش کر رہی تھیں — دن میں کئی کئی بار منہ دھونا۔ کنگھی کرنا باقاعدہ
دانت مانجھنا — سبھی کچھ شروع ہو گیا تھا — یوں سرمہ تو روز ہی لگاتی تھیں
اب بیگم کیلئے یہ مناظر قریب ناقابل برداشت ہو چکے تھے۔ لیکن میرے سمجھانے
بجھانے سے خاموش تھیں اور میں ڈر رہا تھا کہ اگر شیخانی چلی گئیں تو آدھے درجن کے قریب
یتیموں کا کیا حال ہو گا — دوسرے پھر وہی نوکر کا سوال بجائے خود ایک
میری حیثیت سے کم نہ تھا۔
اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کی یتیمی کا داغ ممکن ہے کہ قابل دید نہ ہو سکتا۔
لیکن بیگم کے طعنے اور دوستوں کا مضحکہ — ایک کوفت ایسی نہیں تھی جس کو
آسانی کے ساتھ برداشت کر لینے پر میں تیار ہو جاتا۔ شیخانی کو سمجھانے کے معنی بھی یہی
ہے کہ بیٹھے بٹھلائے آگ پر تیل چھڑک دیا جائے! غلامی کو نصیحت کرنا بھی گویا
شیخانی کے سینہ پہ عشق کو ایک قسم کا [illegible] ہی دینا تھا — غرضیکہ ہم لوگ بری
طرح کشمکش میں پڑ گئے تھے — اور ابھی اسی [illegible] پہ غور ہی کر رہے

تھے کہ کیوں نہ غلامی کو جواب دیدیا جائے۔ شاید سی طرح شیخانی کی محبت میں کوئی ٹھہراؤ پیدا ہو سکے کیونکہ رمضانی کے ہٹا دینے پر رفتہ رفتہ شیخانی کا جذبۂ محبت خود بخود سرد پڑ گیا۔ کیونکہ بہت دنوں تک اس رمضانی کے فراق میں اس حد تک بیحال تھیں کہ مرنے جینے کا ہوش باقی نہ تھا ـــــ پھر آخر صبر آ ہی گیا ـــ!

ہم اور بیگم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ایک شام کو ـــ یعنی جمعہ کی شام کو! شیخانی معہ اپنے نورِ نظر غلامی کے غایب ہو گئیں میرے بچوں کو ہڑکتا چھوڑ کر ہے جیسے کیسے بیگم نے چولھے کا منہ پھونکا بچوں نے تمام رات بری طرح رو رو کر گزاری ـ!

سویرا ہوا تو شیخانی آئیں دلھن بنی ہوئیں۔ شاہانہ جوڑا پہنے کچھ لجائی۔ کچھ شرمائی ـــــ معلوم ہوا کہ رات کو غلام محمد صاحب سے عقد فرما لیا ہے! آپ حساب لینے کیلئے تشریف لائی ہیں ـــــ بیچارے بچے کیا سمجھتے کہ ایک شب کی بیاہی دلھن ان کی ماں نہیں بن سکتی۔! چاروں طرف سے چمٹ گئے، مارے غصے کے بیگم کا برا حال تھا ـــ لیکن میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ " نوکر تو کہیں ملتے نہیں ـــ!

"یہ ریڈیو والے"

ہا..........ئے! رسولن نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ـــــ آج تو اس بنو کی بچی نے غضب ہی کر دیا ـــ اب میں کیا کہوں آپ سے۔

کیا ہوا خیر تو ہے رسولن ـ بیگم کی انگلیاں سروتہ کی گرفت پر جم کر رہ گئیں۔!

بس کچھ نہ پوچھیے بیگم صاب! رسولن کی سانس تیز تیز چلنے لگی ہوئے سینے میں پھڑپھڑانے لگی میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ہائے یہ حرام زادی بنو کی بچی ـــ خدا غارت کرے ـــ اس موئی کو ـــ اللہ سمجھے رنڈی ـــ کمین ـــ بیسوا ..... ! آخر ہوا کیا۔ بیگم نے پوچھا ـــ کیا کیا بنو نے!

کیا کیا ـــ بیگم صاحب! رسولن بولی ـــ اگر میں آپ سے بیان کر دوں ـــ تو آپ مجھ کہنے والی کو ابھی زندہ جان چنوا دیں! اور اس نصیبوں مٹی کا تو کہیں بھی ٹھکانا نہ رہے ـــ!

ســـنا رسولن۔ بیگم کو تاؤ آگیا۔ مجھے تیری یہ گول مول باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اگر کہنے والی بات نہیں تھی تو میرے سامنے ذکر ہی کیوں کیا ـــ اور جب ذکر کیا تو پوری بات بتانا پڑے گی تجھے! ورنہ ـــــ جانتی ہے میں بری طرح پیش آؤں گی۔

جی ـــــ بیگم صاب! آپ کے بس غصہ سے تو میرا دم نکلتا ہے۔ رسولن نے

کانپتے ہوئے کہا اور رونی صورت بنا دی۔
بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔ میں کہتی ہوں آخر ہے کیا ۔؟ پوری بات کیوں نہیں
کہتی۔ بیان کر میں خفا نہ ہوں گی ۔؟
"آپ کو اللہ کی قسم ۔ رسولن نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ چھوٹے میاں سے نہ
کہیئے گا ورنہ میرے سر میں ایک بال بھی باقی نہ رہے گا ـــــ اور ـــــ اور ـــــ ان
کی کوئی خطا نہ ہوگی ـــــ یہ جو بنّو حرامزادی ہے خود ہی ....!
چپ کیوں ہو رہی پوری بات کیوں نہیں بتاتی آخر!
بیگم رسولن سے کچھ اور قریب ہو گئیں ۔
"حضرت بی بی کی مار پڑے مجھ پر جو جھوٹ کہتی ہوں آپ سے! رسولن نے
سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ آج جب میں بڑے کمرے کے حمام
سے میلے کپڑے اٹھانے گئی .... تو (رسولن کی زبان لڑکھڑانے لگی) .... تو یہ ہوا
.... کمرے کے دروازے بند تھے .... اور ـــــ وہ جو صوفہ بچھا ہوا ہے مسہری کے
پاس اس پر چھوٹے میاں لیٹے ہوئے تھے! زمین پر ...... یہ حرامزادی بنّو بیٹھی ....
آپ ہی سے گئی تھی ـــــ چھوٹے میاں نے چڑیل کو بلایا بھی نہ ہوگا ۔ میں سچ کہتی ہوں
اس میں چھوٹے میاں کی کوئی غلطی نہیں تھی ـــــ یہ خود ان کے پاس گئی ہوگی "
"ہاں پھر کیا ہوا رسولن (بیگم نے رازدارانہ انداز سے پوچھا) اور کیا دیکھا "
" اور کچھ نہیں ـــــ چھوٹے میاں نے کچھ نہیں کیا ۔ ان کی کوئی غلطی نہیں تھی۔
رسولن برابر چھوٹے میاں کی صفائی دے رہی تھیں ۔ اس مال زادی بیسوا نے خود ان کے
زانو پر سر رکھ دیا ہوگا ـــــ اور پھر تو وہ مرد تھے! کہنے لگی قطامہ۔ حرامزادی کہ آپ مجھ سے بیاہ
کر لیں وہ بالکل رضامند نہیں ہوئے ـــــ بس میں نے اتنا ہی دیکھا ۔ اللہ میری توبہ!

اب تک جب یاد کرتی ہوں پسینے پسینے میں شرابور ہو جاتی ہوں (رسولن کی سانس پھولنے لگی)

—— بیگم صاحب میری لاج آپ ہی کے ہاتھ ہے! اب اگر سن لیا چھوٹے میاں نے —!

مار ہی ڈالیں گے مجھے ——!

بیگم پر کچھ دیر کیلئے سکتہ سا ہو گیا —!

یہ حرامزادی بنّو کی بچی —— میں تو پہلے ہی سے کھٹکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور دال میں کالا ہے —— اس کے طور طریقے اللہ جانتا ہے رسولن مجھے کبھی ایک آنکھ نہ بھائے —— اللہ - میری رسولن - سچ کہنا ...... کبھی اور کچھ بھی دیکھا —— بیگم نے مزید تحقیقات شروع کر دی -

آپ کے قدموں کی قسم - رسولن بولی - اس سے پہلے میں نے چھوٹے میاں کو کبھی نہیں دیکھا —— اور کچھ نہیں دیکھا —— وہ تو بیچارے بڑے سیدھے ہیں —— اور یہ میری سوت بنّو —— یہ تو بچپن ہی سے ایسی ہے!

کیسی ہے! بیگم نے پوچھا

- ارے یہی بنّو جب کنواری تھی! اس سوّر کے بچے رحمت سے اس کا میل! جنو پر یہ جان دیتی تھی جو منجھلے میاں کے پاس نوکر تھا بھاگ گیا —— سبھی جانتے ہیں —— بڑا بدمعاش تھا - کم بخت —! رسولن نے بنّو کی گناہ بھری زندگی کی ساری داستان کہہ ڈالی دو لفظوں میں -

میں کہتی ہوں! بیگم آہستہ سے پوچھنے لگیں! - ان - کے متعلق تو نے کبھی اور کچھ سنا ——!

- چھوٹے میاں -: میری گور میں کیڑے پڑیں بیگم صاحب! اگر آپ سے جھوٹ بولوں میں نے کبھی نہیں سنا! رسولن نے کہنا شروع کیا! ویسے تو مرد ہیں! رات برات

اکثر ان کے دوست احباب جمع ہو جاتے ہیں تو میں نے خود دیکھا ہے کوئی نہ کوئی عورت زور زور سے گاتی ہے بولتی ہے! اور کچھ نہیں دیکھا کبھی ـــــ!

کیا باتیں ہوتی ہیں ـــــ بیگم بولیں!

"وہ باتیں! رسولن نے جواب دیا ـــــ اب نہیں ہیا، وہ سے پہلے جب سب لوگ جمع ہوتے تھے تب ہوتی تھیں! میری توبہ ـــــ ایسی باتیں ہوتی تھیں ـــــ اللہ میری توبہ (رسولن اپنے گالوں پہ ہلکے ہلکے طمانچے لگانے لگی۔ کچھ نہ پوچھیئے بیگم صاحب!"

اتنے میں سامنے سے چھوٹے میاں آتے ہوئے دکھائی دیئے ـــــ رسولن جلدی سے باہر چلی گئی اور وہ کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

شام کے سات بجتے ہی چھوٹے میاں کے کمرے میں اچھا خاصا مجمع لگ جاتا ہے بیگم مع اپنے پاندان کے! رسولن۔ صابرہ، منّو۔ اور جنّت اس طرح ریڈیو کو گھیر کر بیٹھ جاتیں جیسے سینما کے پردے پر تماشائی نگاہیں جما لیتے ہیں۔ چھوٹے میاں نے سوئچ دبایا کہ فرمائشوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہو گیا جیسے کسی گانے کی محفل میں فن جاننے والے تماشبین فرمائش کرتے ہیں۔

"وہ ـــــ دادرا ـــــ تو آپ کو یاد نہیں ہے ـــــ آؤ ـــــ ہم ڈس ساجن ـــــ!

"بائی جی ـــــ وہ غالب کی غزل شروع کیجئے جس کا بول ہے

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی۔

"سینہ پر جا۔ یا نسیم کا گایا ہوا کوئی گیت تو آپ کو یاد نہ ہوگا ـــــ!

"اجی صاحب بند کیجئے مشاعرہ ـــــ کوئی پھڑکتی ہوئی چیز سنائیے۔

"استاد جی ـــــ میں نے کہا کوئی بھجن عنایت ہو بھجن ـــــ!

مصیبت میں بھی نہ ریڈیو اپنے قابو کی چیز! نہ یہ عورتیں اپنے بس کی۔ سچ پوچھئے جس کی جان کو سنبھال نہ ہو وہ بیٹھے بٹھلائے ریڈیو خرید لے! پھر کیا ہے! محلہ والے، شہر والے دوست احباب، عزیز اقربا، سبھی چراغ جلے سے موجود ——— اور اگر جان بچانے کیلئے گھر کے کسی کونے میں رکھ دیجئے تو ——— بیگم کا حکم، رسولن کی فرمائش، بہو کی خواہش غرضکہ ہر طرح پر مصیبت! گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ——— ! چھوٹے میاں کیلئے بھی یہی جھگڑے تھے جن سے گھبرا کر وہ کلکڑوں کو کان ذرہ ہی پھونک دینا چاہتے تھے ، مگر چار دن کی بیاہی ہوئی دلہن کا خیال مجبور کر دیتا ان کو ——— !

گھوڑا ——— بیلچ ——— ندی کی باڑھ ——— اور عورت کی بدگمانی، اس تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے جیسے طوفان میں! جس گھر میں بدگمانی کی آگ لگ جاتی ہے ——— وہاں بجھانے والوں کے پانی سے بھرے گاگر ——— سرسوں کا تیل بن جاتے ہیں۔ نیک صلاح دینے والوں کی فیصلہ کن باتوں سے طرفداری کی بو آنے لگتی ہے! چھوٹے میاں کے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ چار دن کی بیاہی دلھن! امنگوں بھری راتیں، شباب اور محبت کے لاشعوری نغموں سے دور ——— رسولن کے بیان کئے ہوئے دل دکھانے والے واقعات پر کروٹیں بدل بدل کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دیتی!

رسولن ——— کی عورتوں کو مشرقی تہذیب و تمدن کے گھرانوں میں بڑا ہی ممتاز درجہ حاصل ہوتا۔ جیسی نیابت رسولن کی تھی دراصل ——— اور حکومت کرو" کا فلسفہ اس طبقے سے بہتر آج تک نہ کوئی سلطنت سمجھ سکی نہ حکومت! یہی وجہ تھی کہ رسولن نے آٹھ دن کی ریشہ دوانیوں سے اس گھر میں اچھا خاصہ اقتدار قائم کر لیا تھا۔ ———

جو ایسی منہ چڑھی خادمہ ——— دلہن کی تدبیروں سے اس طرح الگ کر دی گئی ———

تھا۔ اور رسولن نے بُری طرح یہ فریب دے رکھا تھا کہ چھوٹے میاں کی سیاہ اور تاریک
زندگی عنقریب بے نقاب ہوا چاہتی ہے! اور یہ حرامزادی بنو کی بچی .... خدا اسے
غارت کرے! بیگم کا چہرہ تمتما اٹھا — عجب نہیں یہ خیال آجاتا کہ یہ بنو میرے سہاگ کی ساجھے
دار بننا چاہتی ہے — کمینی — بدذات! میرے شوہر پر اپنی بیباک نگاہوں کے ڈورے
ڈالنا چاہتی ہے — خوبصورتی — جوانی — رعنائی، کس چیز میں وہ مجھ سے بڑھکر
ہے۔ ہاں — اس کے دیدوں کا ڈھلا ہوا پانی — نور میری آنکھوں میں ہوتا
— چمکیلی — خوفناک — بنو کی ایسی آنکھیں جن میں شرم وحیا کا نام بھی نہیں
کولے مٹکاتی چلتی ہے بہڑیل پرائے مردوں کو رجھانے!

میں کہتی ہوں بیہودہ! اللہ جانے باہری عورت کو دیکھکر اس طرح ایمان
کیوں کھو بیٹھتے ہیں جیسے کبھی عورت کو دیکھا ہی نہیں! گھر میں بیوی چاہے جیسی خوبصورت
سی خوبصورت بیٹھی ہو — مگر یہ لوگ دنی بازاری — کسبیوں پر ڈانواں ڈول پھرتے
ہیں — ان کی مٹکتی ہوئی آنکھوں پر — لچکتی ہوئی کمر پر — عریاں لباس پر
— مسکراہٹوں پر! بناوٹی اور جھوٹی اداؤں پر — یہ جو قسمیں کھاتے ہیں سیکڑوں
اللہ جانے رسولن ان کی کہانی بیان ہے۔ بنو سے اس کا کون — سوتیلا تا — سچ مچ
بٹے وہ — معلوم ہوتے ہیں صورت چاہے جیسی مسکینوں جیسی بنالیں — مگر ان
کے دل کا چور میں خوب سمجھتی ہوں: جو گرجتے بہت ہیں — برستے کم ہیں۔ بات بات
پر قسمیں کھانیوالا — بس اتنا ہی سچ بولتا ہے جیسے دال میں نمک!

[illegible] کے ہی پر گاؤ سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی
ہواؤں نے ان کی آنکھوں پر ہلکی ہلکی غنودگی کا باریک سا پردہ ڈال دیا تھا — سارا
گھر کا گھر کام کاج میں مصروف و منہمک تھا۔ کہ نہایت گھبرائے ہوئے عالم میں رسولن
نے آکر بیگم کو جھنجوڑا۔

بیگم صاحب، بیگم صاحب"
بیگم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ــــ رسولن نے ہاتھ کے اشارے سے چپ ہو جانے کی ہدایت کرتے ہوئے دھیرے سے کہا!

"ذرا میرے پیچھے چلی آئیے۔"

"کہاں"ــ بیگم نے آہستگی کے ساتھ پوچھا ــ

"میاں کے کمرے تک۔ رسولن نے جواب دیا ــ

بیگم جلدی سے اٹھ بیٹھیں ــ ان کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا ــ اور غصے کے مارے ان کے سارے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی تھی۔ ننگے ہی پاؤں رسولن کے پیچھے پیچھے ہو لیں ــ چھوٹے میاں کا کمرہ قریب ہی تھا بات کی بات میں دونوں کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے! کمرے کے اندر اندھیرا گھپ تھا اور دروازہ بھڑا ہوا ــ رسولن نے بیگم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ــ

"سنیئے"

بیگم نے دل کڑا کر لیا ــ واقعی جیسے اندر سے کوئی عورت چیخ رہی تھی!

"کمینے ــ بدذات ــ بدمعاش ــ چھوڑ دے ــ چھوڑ دے! مجھے چھوڑ دے! میری زندگی ــ تو میرا جیون تباہ کر ــ برباد نہ کر ــ اپنے خدا کے لئے چھوڑ دے مجھے!"

بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئیں ــ

"واقعی بیچاری ــ بری تھیں ــ!"

"ظالم ــ میری زندگی ــ میری آبرو ــ ــ ورنہ میں سب کچھ لوٹ کر تو شکر نہیں اٹھا سکتا ــ چین نہیں پا سکتا ــ ہ ــ پاپی ــ ...!"

دوسری ہوائی آواز گرج رہی تھی ـــــ

"نہیں ـــــ عشرت ـــــ نہیں! تم ـــــ تم آج میری تمناؤں کا خون کر کے نہیں جا سکتیں ـــــ ہرگز نہیں جا سکتیں! یہاں سے!"

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ظالم مرد نے اس بے بس عورت کو اپنے پنجۂ ہوس میں دبوچ لیا ہے۔

ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سارے کمرے میں گونج گئی ـــــ!

بیگم نے دوہتڑ مار کر دروازہ کھول لیا ـــــ اور چشم زدن میں رسولن اور بیگم کمرے میں پہونچ گئیں۔ رسولن نے بڑھ کر بجلی کا سوئچ دبایا ـــــ سارا کمرہ برقی شعاعوں سے جگمگانے لگا۔ بیگم زار و قطار رو رہی تھیں اور رسولن کی آنکھیں سی مرد کی سہمی ہوئی منفعل آواز پھر کانوں میں گونجنے لگی ـــــ:

"عشرت۔ مجھے معاف کر دو ـــــ اپنے خدا کے لئے بخش دو ـــــ بخش دو میں گنہگار ہوں ـــــ پاپی ہوں مجھے معاف کر دو ـــــ عشرت ـــــ!"

ہچکیاں لے لے کر روتی ہوئی عورت کی آواز آ رہی تھی بیگم پر ایک سکتہ سا ہو گیا تھا۔ رسولن دم بخود تھی کہ پھر آواز آئی!

"یہ لکھنؤ ہے ـــــ ابھی آپ "پاپی" ڈرامہ سن چکے ہیں۔ اب آپ کو بنارس کی رسولا بائی ایک گیت سنائیں گی جس کے بول ہیں۔ "اندھیارا چاروں اور ـــــ اندھیارا ـــــ!"

بالکل اسی وقت چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

"ہائیں ـــــ ... ... ریڈیو کس نے کھولا ـــــ!"

یکبارگی سب کی ... ریڈیو کی ... لال لال روشنی پر جا پڑیں ـــــ بیگم دوڑ کر چھوٹے میاں کے قدموں پر ... اور رسولن کمرے سے باہر چلی گئی ـــــ یہ کہتی ہوئی!

"اوہ ـــــ یہ ریڈیو ... ـــــ"

تھارو دیس

۔ تین تین دن ناغہ کرکے دودھ لاتی ہے لے جا! مجھے نہیں چاہیئے ———
پیسوں سوموار کو آکر اپنا حساب لے جانا! ۔ مشین بابو نے غصہ میں رعب جماتے ہوئے کہا۔

۔ نہیں بابو جی ——— آج تین دن سے ہم لوگ اپنی ۔ بستیا ۔ میں پڑے
تھے۔ اسی واسطے دودھ نہ آسکا۔ میری ۔ جیا ۔ کو سکھوا بھگا لیگیا۔

اس نے رونی صورت بناتے ہوئے معذرت کی!

تیری ۔ جیا ۔ کو سکھوا بھگا لیگیا ——— مشین بابو نے تعجب سے پوچھا!
کہاں بھگا لے گیا — ؟

سنا ہے ——— نوابی بھگا لیگیا ہے ——— تھارو دیس —!
خوبصورت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے —!

تھارو دیس ——— نوابی!

مشین بابو کے حیرت کی انتہا نہ رہی —
پھر ——— تھانے میں رپورٹ نہیں لکھوائی ——— بابو نے کہا!
بابو غریبی میں کچھ بنائے نہیں بنتا ——— اور پھر بڑی ندی میں اپنیا
بھی تو ہے ——— تھانے جانا مشکل! اس نے جواب دیا۔

چہ ——— چہ ——— چہ ——— بابو افسوس کرنے لگا۔
ہندوستان کی غریبی کا یہ عالم ہے کہ ہمدردی بھی مشکل ہے! وہ سوچنے

لگا ـــــ !

"رجنی تیری، جیا، کا بیاہ نہیں ہوا تھا ـــ کیا ـ؟"

ہوا تو تھا بابو ـــ رجنی نے اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا ـــ مگر گونا نہیں ہوا تھا ـــ پھر ـ اب کیا ہوگا!

بابو سوچنے ـــ لگا

"کچھ نہیں ـــ برادری کی روٹی تو پڑ ہی جائیگی ـ بھائی بندی کا کھانا! رجنی نے بالٹی میں دودھ انڈیلتے ہوئے جواب دیا ـ

بھائی بندی کا کھانا ـــ

بابو نے پوچھا!

وہی برادری کی روٹی جو پڑتی ہے بابو ـــ پنچ وہ تو دے ہی لینگے

رجنی اس سے زیادہ صاف طریقہ پر اپنا مطلب نہ سمجھا سکی!

مشین بابو کی حیرت کی انتہا نہ رہی! ایک تو لڑکی ہاتھ سے گئی دوسرے بھائی بندی کی روٹی! اس کے دماغ میں مفلس ہندوستان کے مکروہ مذموم رسم و رواج چکر کھانے لگے! مرے پر سو دُرّے اسی کو کہتے ہیں.

اور اگر روٹی نہ دی تو کیا ہوگا ـــ رجنی

وہ بولا ـ

پھر کیا ـ رجنی نے کہا! بابو برادری والے حقہ پانی بند کردیں گے اور کیا!

مشین بابو نے ایک موٹا سا بادامی رجسٹر اٹھا کر اس کے ہاتھ لکھے ہوئے دودھ کا حساب دیکھتے ہوئے کہا!

"اگر تو چاہے تو تیرا حساب آج ہی دیدوں!

بڑی دیا ہو گی ـــــ بابو! رجنی کی آنکھوں سے شکریہ کی بارش ہونے لگی!

وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

مشین بابو نے ایک دوسرا بادامی رجسٹر نکال کر اسکا تمام حساب کر ڈالا ـــــ انگوٹھے پر نشان لگانے کی سیاہی لگاتے ہوئے اس نے رجنی کی طرف دیکھا۔

رجنی اسکا مطلب سمجھ گئی اور سیدھا ہاتھ بڑھا دیا بابو کی طرف!

مشین بابو نے اس کا گرم گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو ایسا معلوم ہوا کہ بجلی کا کرنٹ اس کے جسم سے پاس ہو گیا۔

- تیرا ہاتھ کتنا گرم ہے ـــــ رجنی۔

بابو صبر نہ کر سکا۔

رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بابو نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی بڑھتی ہوئی جوانی کی قیمت ۰ روپے سے زیادہ نہیں ہے!

گرم گرم ہاتھ کی ملائم انگلیاں انگوٹھے سے علیحدہ کر کے بابو نے سیاہی کے پیڈ پر اسکا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ذرا ہاتھ ڈھیلا کر دو ـــــ

رجنی کا ہاتھ ڈھیلا ہونے کے بجائے کچھ سخت پڑ گیا۔

نہیں ـــــ ڈھیلا کرو ـــــ ڈھیلا ـــــ!

بابو نے کہا۔

رجنی کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ مشین بابو نے رجسٹر کے ایک کونے پر اس کا انگوٹھا لگوا لیا اور روپے دیدیئے

رجنی دودھ کا خالی برتن اٹھا کر برگد کے ایک سوکھے پتے سے اپنا

سیاہی بھرا ہوا ہاتھ پونچھتی ہوئی چلی گئی ۔

مشین والے بابو نے بادامی جسم کو دیوار کے قریب بچھی ہوئی لکڑی کی
پیٹائی پر رکھکر برن مارکہ بیڑی سلگالی ۔! اس کی نگاہوں میں دودھ کی تمام بالٹیاں ،
مکھن اور کریم کی مشین ۔ پھوس کا چھپر ---- اور بوڑھے برگد کا درخت اپنی
زمین بوس گھنی داڑھی کے ساتھ ناچ رہا تھا ---- ہر چیز جھوم جھوم کر رقص کر رہی تھی
---- یہ ہندوستان جس کی رومانی زندگی کیف زار دیہاتوں میں کہی جاتی ہے! ----
اس کے رومان کتنے بھیانک ---- کٹھن ---- بھیانک مصیبتوں سے بھرے
ہوئے ---- اور پتھر کی سنگدل سلون کی طرح سخت ہوتے ہیں ---- جہاں
عورت کی عزت ---- آبرو ---- اور لاج ---- کی قیمت سوکھی روٹی کے
سماج ---- یوں تو سبھی ظالم ہوتے ہیں ---- مگر اس ہندوستان کا سماج
کتنا ہلکا اور سُبک ---- کتنا کم قیمت ---- اور ---- اور کتنا حقیر
چھوٹا ہے ۔! جس میں عورت کے جمال آبرو ---- عصمت ---- اور نسوانیت
کا بدل صرف روٹی کے سوکھے ٹکڑے ---- اور کچھ نہیں ؟
اور یہ عورتیں ---- تو جھک کیوں جاتی ہیں دوسروں کے ساتھ!
جب ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی سادہ زندگی کتنی بے مایہ ---- اتنی حقیر
اور کم قیمت ہے جس کا معاوضہ روٹی کے چند ٹکڑے ہو سکتے ہیں ---- تو ---!
پھر ہندوستان ---- اتنا تو غریب بھی نہ تھا گئے زمانے میں ---- جب
ہندوستان پر ہندوستانیوں کا راج تھا! یہ ایسا سماج کیوں بن گیا اس
زمانے میں آخر ---- جانے کیوں سماج کے بندھن سخت جیسے اور کمزور
بنا دیئے گئے ---- جانے کیوں ---- سماج ---- نے ---- یہ سب

کچھ سوچتے سوچتے۔ اور وہ بھی تو تھا ایک مشین کا بابو ہی! یہ بابو لوگ جو دن بھر پنواڑیوں کی طرح سر کھپاتے ہیں ان کے دماغ کتنے محدود — اور کتنے مجبور ہوتے ہیں! بیچارے ٹھہرے نا — بابو! ان کی زندگی انہیں موٹے موٹے سفید اور بادامی رجسٹروں میں بند ہوتی ہے — اس سے زیادہ اور سوچ بھی کیا سکتے تھے!

دودھ اور کریم کی مشینوں نے، رکھی ناتھ کو، رکھی ناتھ سے مشین بابو بنا دیا تھا سارے بانسی پور میں اسے سبھی مشین بابو کہتے تھے شاید وہ سمجھتے ہونگے کہ یہ بابو لوگ بھی کسی قسم کی مشین ہوتے ہیں — حالاں کہ وہ تو صرف مکھن اور کریم کی مشینوں کے بابو تھے۔ جو ادھ ڈیری فارم نے اودھ فارسٹ کے قریب نیپال کی ترائی میں لگا رکھی تھیں — اور پاس پڑوس کے تمام دیہاتوں کا دودھ خرید کر کریم اور مکھن وغیرہ بنا کر بڑے بڑے ٹین کے پیپوں میں بند کر کے اسٹیشن روانہ کر دیتے تھے اور بس!

رکھی ناتھ کتنے دنوں سے جینی کو جانتا تھا کوئی دو ڈھائی سال سے جب وہ بہت چھوٹی تھی! جینی اتنی جوان نہ تھی جتنی جوان ان دنوں میں ہو چکی تھی — !چھوٹی لڑکی — نا سمجھ — اور اب تو اس کو دیکھ کر یاد ھو گوالہ تک گنگنانے لگتا ہے۔

۔ بجریوں سے مار مار — ہمکا بلدین — ہاں — ہاں —

جینی کی بہن کون ایسی خوبصورت تھی جسکو کھوا تھا دیس بھگا لیگیا۔

تھا دو دیس — شاید اس دونیلے بہت دور کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں باپ کو کوئی

پاپ نہ جانتا ہوگا ـــــ نہ وہاں پولیس ہوگی ـــــ نہ تھانہ ـــــ نہ ڈپٹی صاحب ـــــ
اور نہ تحصیلدار ـــــ ریل بھی تو وہاں نہ جاتی ہوگی ـــــ جبھی پاپ کرکے سب تھارو دیس
بھاگ جاتے ہیں ـــــ گنتو کہتا تھا کہ تھارو دیس میں لڑکیاں بہت سستی بکتی ہیں ـــ کہو
تو لادوں! تمکو بھی ـــــ وہ ایک بابو! بڑا اُچکّا ہے یہ گنتو ـــ جسدن مشین پر کوئی لڑکی اکیلی
دودیکر پہونچ جاتی ہے اس کی سب ہلاک ہو جاتی ہے ـــ کس طرح دائیں آنکھ
میچ کر بائیں کھول دیتا ہے ـ وہ بیچاری دیہاتی لڑکیاں کیا سمجھیں کہ یہ بدمعاش گنتو
آنکھ کیوں مارتا ہے ـ وہ مسکراتی بھی نہ ہوں گی ـــــ

اب ان لوگوں کو بھائی بندی کا کھانا دینا ہوگا ـــــ بھگوان کیسے دے ر
پائیں گے یہ پنچایت کی روٹی! غریبوں کو ایک وقت پیٹ بھر کھانا بھی تو نصیب
نہیں ـ یہ اتنا بڑا کام رجنی کے ماں باپ کیسے کر پائیں گے ـ ؟

اور اگر پنچایت میں شامل نہ ہو سکے تو پھر یہ سماج کے ٹھیکیدار رجنی کا
بیاہ بھی نہ لیں گے ـــــ اور پھر ایشور جانے ـــــ جانے پھر کیا ہو ـــــ
مشین بابو جانے کب تک یہی سب کچھ سوچتے رہے ؛

ـ رجنی کی بہن کے بھاگ جانے کے چرچے اب مانسی پور سے نکل کر دور
دور تک پھیل چکے تھے ؛ جو کہتا تھا وہ یہی کہتا تھا کہ یہ سب کچھ کلجگ کی مایا ہے جو بن
بیاہی کنیا پرائے انجان مرد کیساتھ بھاگ گئی ! ہر جگہ سماج کے کرتا دھرتا ہوتے تو مرد
ہی ہیں ـ پھر وہ سکھوا کو نردوش کیوں نہ ٹھہراتے ؛ حالانکہ وہ خوب جانتے
تھے کہ سکھوا چھٹا ہوا ـــــ بدمعاش ـــــ آوارہ اور بدچلن لونڈا تھا؛ ایک رجنی کی بن

بھی تو منی کی سگی بہن ـــــ یہ اور بات تھی کہ رجنی نے ایک آدھ بار۔ کلو چمار اور سوہنی پاسی کے لڑکے کو نیلی پیلی آنکھیں دکھا کر ڈانٹ دیا! لیکن اس سے گاؤں کے دوسرے مستقل مزاج نوجوانوں کے دلوں پر کب اوس پڑ سکتی تھی ـــــ اور گنتو ـــــ تو جیسے مشینوں کا بڑا افسر تھا۔ مشین بابو کے بعد ـــــ مکھن اور کریم کی تمام مشینیں دھونا۔ پیپوں میں کریم اور مکھن بھرنا سبھی کچھ اس کے ہاتھ میں تھا ـــــ دودھ پھنواتے وقت تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے والے ہوتے! کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایسے کھڑا ہوتا ـــــ جیسے تھانیدار! رجنی کے دودھ میں طرح طرح کے عیب نکالنا! کئی کئی بار پھنوانا ـــــ اور آنکھیں مارنا ـــــ گنگنانا۔ اس کے روزمرہ میں داخل تھا! مشین بابو کو اکثر اس کی یہ باتیں بری معلوم ہوتیں ـــــ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ گنتو سے بگاڑنا ٹھیک نہیں! اگر اس نے کہیں کریم کا کوئی گھان خراب کر دیا ـــــ یا مکھن کا ماؤ بگاڑ دیا ـــــ تو کمپنی والے اس پر جرمانہ کر دیں گے ـــــ وہ نوکری سے ہٹا دیا جائیگا ـــــ ایسی اچھی نوکری اس زمانہ میں کہاں مل سکتی ہے ـــــ بڑے بڑے بی اے، ایم اے مارے مارے پھرتے ہیں ـــــ وہ تو صرف میٹرک فیل ہے ـــــ

دودھ کی بالٹیاں کھنکھناتے ہی گنتو پمپ کوارٹر سے باہر آگیا۔ برگد کے اسی گھنے پیڑ کے نیچے جس کی ٹہنیوں پر [illegible] میں جھولا جھولتے تھے ـــــ ساون کے دن آئے ـــــ [illegible] رہی ـــــ ساون کے دن ـــــ اس نے گنگنا کر برگد کی داڑھی کو جھونکا دیا ـــــ شیامو نے اپنی بالٹی دوسری طرف کھسکا دی ـــــ اور کھڑا ہو گیا ـــــ!

ـــــ ایم ـــــ واہ!

جے رام ـــ بھائی ـــ جے رام جی کی ـــ!

گنو نے آنکھ کے اشارے سے بلاتے ہوئے کہا! شیاموؔ اٹھکر گنو کے قریب پہنچ گیا اور دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے کوارٹر میں چلے گئے!

" کہو یار ـــ کیا رنگ ہیں؛ کیا کہتی ہے اب!

" گنو دادا ـــ وہ بڑی ضدن ہے ـــ مانتی نہیں!

شیامو نے جواب دیا ـ

واہ بھائی ـــ یہی کہتے تھے کہ میرے کہے میں ہے! اجاؤ ـــ بس! دیکھ لیا ـــ!

گنو نے کہا ـ

گنگا کی قسم " شیامو بولا " جھوٹ نہیں کہتا ـــ!

" ابے جا " گنو مسکرایا " بس ایک دفعہ ملوا دے! پھر دیکھ لینا ـــ!

ہاں یہ بات ہے ـــ تو رہی!

شیامو کہنے لگا!

لاؤ ہاتھ ـــ!

گنو نے بات پختہ کرنے کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا! شیامو نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا اور دونوں مسکرا کر کوارٹر سے باہر نکل آئے ـــ!

دوسرے دن شام کو گنو جب کریم اور مکھن کی مشینوں کو گرم گرم کھولتے

ہو ــ پانی سے دھو کر بالٹیاں رکھنے کیلئے مشین بابو کے کوارٹر میں آیا تو اس ــ نے
لالٹین کی دھیمی لو ــــ کچھ اور تیز کر دی ،
مشین بابو ــــ کیا سو گئے !
لالٹین کی تیز تیز شعاعیں بابو کی بند آنکھوں پر سم گئیں ، اور پپوٹوں کی
کھال جھلملانے لگی !
گنّو نے دھیمے سُروں میں وقت کی ایک تان اڑا دی ــ
۔ اندھیرا ہو رات بھی ــــ رہیو کہ جیو ۔
۔ رہیو کہ جیو ۔ ہاں ــــــ ہاں ــ !
مشین بابو نے کروٹ لے لی !
کیا ہے گنّو ــ ؟
کچھ نہیں ــــ بابو سرِ شام ہی لیٹ رہے ! کیا بہت تھک گئے
ہو ؟ گنّو نے کہا ۔ بدن داب دوں تمھارا ــ ؟
نہیں جی ــــ کچھ ایسا تھوڑا ہی تھکا ہوں !
مشین بابو نے جواب دیا ۔
اور بھی کچھ سُنا ــ گنّو کہنے لگا ، وہ منّی کی بہن ! رجنی بھی اب بہ
نکال رہی ہے ــ !
وہ کیسے ــ !
مشین بابو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا !
جیسے اس کی بہن منّی نکال چکی ہے ــــ !!

گنّو مشین بابو کے پلنگ سے اور قریب ہو گیا! کہنے لگا ــــ

" اور کریگی بھی کیا! بیاہ منگنی ہونے سے رہا ــــ یاروں کے پہلو گرم نہیں کریگی تو کرے گی کیا ــــ؟ اسکی آنکھوں میں شرارت چمکنے لگی ــ

مشین بابو کو سکتہ سا ہو گیا ــــ مگر گنّو سے کچھ کہنے کی ہمّت نہ پڑی گنّو کچھ دیر مشین بابو کے انتظار میں کھڑا رہا کہ شاید وہ کوئی بات چیت شروع کریں ــ اب کچھ پوچھیں، لیکن جب مشین بابو کی چارپائی نے کروٹ کا الارم بجا دیا تو آہستہ آہستہ وہ دروازے سے باہر نکل گیا ــ

بوڑھے برگد کی داڑھی چاندنی رات میں اس طرح پریڈ کر رہی تھی جیسے پوری بٹالین جرمنی کے محاذ پر مارچ کیلئے تیار ہے! برگد کی شاخوں میں چمٹے ہوئے چمگادڑ چاند کی روشنی سے گھبرا رہے تھے اور ان کی پھڑپھڑاہٹ چاروں طرف فضا میں چھائی ہوئی تھی! گنّو جب برگد کے دوسرے کنارے پر پہونچا تو اس کے قدم خود بخود ٹھہر گئے !

" وہ " شیامو کی پیٹھ سے چمٹی ہوئی کھڑی تھی ــــ اور اس کا تمام بدن بید کی طرح سے کانپ رہا تھا ــ

گنّو نے پوچھا!

" آ گئے شیامو "

ہاں ــــ دادا ــــ بڑی مشکل سے چھپ کر آئی ہیں دہارانی ــــ!

شیامو نے جواب دیا ــــ!

جیتے رہو ــــ میرے یار! گنّو کہنے لگا! رجنی شرماتی کیوں ہو ــــ!

میں ہوں تمہارا گنتو ------!

شامو رجنی کے سامنے سے ہٹ گیا اور رجنی کا چہرہ چاندنی میں کندن کی طرح چمکنے لگا ۔

۔ جو ایک بات پوچھیں تم سے ۔ بتا دو گی ۔

گنتو رجنی کے قریب ہو چکیا ---

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ---

بولتی کیوں نہیں رجنی !

گنتو نے پھر پوچھا ---

۔ ہاں ۔ کہکر رجنی نے نگاہیں جھکالیں ---!

پنچایئت تو جیسے ہوئی نہیں، گنتو کہنے لگا! اب تمہارا کیا ہوگا ۔ ؟

رجنی چپ چاپ کھڑی رہی ۔

میں کہتا ہوں کہ تم میرے سنگ آجاؤ ---

رجنی اب بھی کچھ نہ کہہ سکی ۔

۔ بولتی کیوں نہیں ۔ مجھپر وشواش نہیں ہے تم کو ---!

۔ گنتو نے رجنی کی آنکھوں میں آنکھیں جمادیں ---

۔ شیامو ---- کچھ دور بیٹھا ہوا بیڑی پی رہا تھا! دونوں کی نگاہوں نے مسکراہٹ میں ہنستے ہوئے خدا جانے کیا فیصلہ کر لیا ۔ گنتو نے آواز دی ۔

۔ شیامو ---- وہاں کیوں بیٹھ گیا --- آتا کیوں نہیں ۔

کہو کیا مہری گنتو دادا ---- شیامو پاس آگیا!

ایشور کی کرپا سے بڑا پاپ ہے شیامو ــــ!
وہ توند سکرانے لگے ۔ رجنی شیامو کی پیٹھ سے آ ایسکر گاؤں کی طرف
چل دی ــــ ۔ وہ بھی سکرا رہی تھی ۔ ــــ

۔ رجنی ۔ بھی پر نکال رہی ہے ــــ! یہ سوچکر مشین بابو کی طبیعت میں بھی ایک
اُکساہٹ سی پیدا ہونے لگی تھی ۔ حالانکہ ان کے دل میں عورت کے خلاف وہ لاشعوری
جذبے موجود نہیں تھے جو عام طور پر نیلی پیلی اور بھڑکیلی ساریوں کو دیکھکر اچانک پیدا ہو جاتے
ہیں آج کل مردوں میں ــــ! غیر اختیاری طور پر وہ ہر عورت کو دیکھکر کچھ ایسا ہی سوچنے
لگتے ہیں جنکو سوچنے کا ادنیٰ بھی اس طرح پر کوئی حق حاصل نہیں ہوتا ــ مشین بابو کے
دل میں انسانیت اور ہمدردی کا جذبہ اگرچہ فطری طور پر موجود تھا لیکن ۔جنسی اکساؤ ۔ بھی
تو آخر انسانی فطرت کا ایک جاگتا ہوا جذبہ ہے ــــ مشین بابو لاکھ با تو قسم کے انسان
سہی، پھر بھی تھے تو مرد ہی! چٹیل میدان میں آزاد بہتے ہوئے دریا کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیکھکر
یوں بھی پیاس لگ آتی ہے ــــ اور پھر رجنی کے تو ۔ پر نکل رہے تھے ۔ وہ سوچنے
لگے کہ گنتو ۔ رجنی ۔ کی کہانی کیوں دہرا رہا تھا! وہ کیوں یہ سب کچھ مجھ سے کہہ رہا تھا ــ
ــ ضرور ــــ مجھے بھی دعوت دی تھی اس نے ــــ میں نے اس کی بات
کا کوئی جواب نہ دیکر ٹھکرا دیا ــــ دعوت کو! بُرا کیا ــ اب کہوں گا گنتو سے کہ مجھے
معاف کر دے ــــ میں اس وقت نیند میں تھا ــــ ہاں کیا ہوا رجنی کا معاملہ!......
یار گنتو ہم بھی ہیں تمہارے ساجھے دار! ہمیں نہ بھول جانا ــــ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ــ
دبلا پتلا جسم! اور مخمور جوانی وہی کہلاتے ہیں گدڑی کے لال ــــ!!

گلے اور بھینسوں کے گلے گھنٹیاں بجاتے ہوئے اس کے کھنڈر کے سامنے سے جنگل کی طرف دھول اڑانے لگے! اس کے خیالات کا سلسلہ ان گھنٹیوں کی آواز میں کھو گیا۔ جلدی سے وہ اٹھا اور کوارٹر کے باہر نکل آیا ۔۔۔ برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے سب دودھ والے دودھ کے مٹکے سنبھالے ہوئے قطار باندھے بیٹھے تھے ۔ اور گنو بالٹیوں میں دودھ پھوار رہا تھا!

مشین بابو دھیرے دھیرے برگد کے داڑھی سے کھیلتا ہوا دودھ والوں کی قطار کے پاس پہونچ گیا! اس کے پاؤں خود بخود بوجھل ہونے لگے۔ برگد کی داڑھی کا ایک بال زمین کی تہ میں پیوست ہو گیا جیسے کوئی دوسرا درخت برگد کے نیچے جنم گیا ہے۔ رجنی اسی داڑھی کی گچھے کے سہارے بیٹھی تھی! مشین بابو کو یاد آ گیا کہ اس کی بن تی تھا! دیس چھاٹ گئی ہے ۔ اور اس کے گھر والوں نے ابھی تک پنچایت کی روٹی بھی نہیں دی ۔ یہ لوگ کتنے مجبور و مظلوم ہیں ۔۔۔ غریب ۔۔ نادار ۔۔۔ مفلس ۔۔! سماج نے ان کی زندگی کی آشاؤں کا گلا گھونٹ دیا ہے! مگر ۔۔۔ اچانک گنو کے سلام نے سے چونکا دیا ۔۔۔ اور ہمدردی کے جاگے ہوئے جذبے جنسی طوفان میں سو گئے! رجنی کے پر نکل رہے تھے! ۔ اور وہ اڑ رہی تھی بہت بلندی پر! سماج والے اسے اڑا رہے تھے کسی ہوائی جہاز پر ۔۔۔ جو نوجوانوں کے منڈتے ہوئے دلوں پر پریم کے گولے برسا رہا تھا۔ انسانیت کا جذبہ بیشک فطری چیز ہے لیکن یہ اکساؤ بھی تو فطرت کی دی ہوئی ایک سوغات ہے! یہ وقت کی چیز ۔۔۔ وقت کا تقاضہ ۔۔۔ اور انسانیت و ہمدردی کے جذبات بڑھاپے کا وچار ۔۔ آخری وقت کی یہ پشیمانی! ہر چیز اور ہر بات اپنے وقت پر شوبھا دیتی ہے ۔ دن کو رات کی ایسی مست نیند ممکن نہیں! جوانی کی

آشائیں، اور امیدیں ۔ بڑھاپے میں کبھی کام نہ آئیگی ۔ جوانی خلش کیلئے اور بڑھاپا سکون کے لئے، دوسرے جیون کے سدھار کی دعاؤں کیلئے !! مشین بابو نے تھوڑی دیر میں جانے کتنا سوچ لیا ۔ لکڑی کے تختوں سے جڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہی ان کی نگاہیں جبنی کی طرف اٹھ گئیں ۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی برگد کے ایک سوکھے ہوئے پتے میں سوراخ کر کے ایک چھوٹی سی لکڑی میں پرو لیا تھا اس نے ۔ ! بچپن اور کمسنی بھی عجیب چیز ہوتی ہے ۔ جانے اس نے کیوں ایسا کیا تھا ۔ ؟

گنوتے بامو کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بھرپور نگاہ جما کر جبنی کی طرف دیکھنے لگا ۔ گویا کہ ہنس رہا تھا مشین بابو کی حماقت پر ! اپنے نمبر پر جبنی دودھ لیکر بالٹیوں میں ناپنے لگی ۔ ۔ تو گنو نے اس کے پیر کے انگوٹھے کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا لیا !

مشین بابو بادامی رجسٹروں پر آنکھیں جمائے ہوئے آج کے آئے ہوئے دودھ کا حساب لکھ رہے تھے ۔

سورج ڈوبنے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی کہ مویشیوں کے گلے گھنٹیاں بجاتے ہوئے جنگل سے لوٹنے لگے ! مشین بابو نے لکڑی کے بڑے سے بکس میں رجسٹروں کو رکھکر تالا لگا دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے ۔ وہ روز اسی وقت اپنا آفس چھوڑ دیتے تھے ۔ یہی گھنٹیاں ان کی گھڑی تھیں ۔ سویرے جب جانوروں کے گلے جنگل جاتے تو یہ مشینوں پہ آ جاتے ۔ اور ان کی واپسی پر کوارٹر واپس آتے ۔ گویا وہ بھی ایک قسم کے جانور تھے جنکا پروگرام انہیں جانوروں کے ساتھ تھا ! اپنے کوارٹر میں پہونچکر مشین بابو نے دھوتی اور لوٹا اٹھایا ۔ ہاتھ سے چلانے والے نمبے پر پہونچ گئے ۔ سامنے ہی گنو کا کوارٹر تھا آدانڈی ۔ !

"ارے گنّو کیا کر رہا ہے ۔ ۔ ؟"
گنّو اپنے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔
"کچھ نہیں بابو ۔۔۔۔ کیا نہاؤ گے ۔۔۔۔ ؟"
"ہاں بھائی ۔۔۔۔ آجاؤ! بابو بولے ۔۔۔!"
گنّو نیبے پر آگیا اور ہتھا چلانے لگا!
مشین بابو نے دیسی صابن جیب سے نکال لیا اور بدن میں رگڑنے لگے۔
"اے یار ۔۔۔۔ گنّو اس دن رات کو کیا کہہ رہے تھے تم! میں تو نیند میں تھا کچھ سُن نہ پایا۔"
مشین بابو نے کہا!
"کیا بابو جی ۔۔۔۔ ؟"
گنّو نے پوچھا!
"اجی وہی رجنی والی بات ۔" مشین بابو نے جواب دیا۔
"وہاں یہی کہہ رہا تھا کہ ۔۔۔ گنّو بولا ۔۔۔ کہ رجنی بڑے زوروں پر ہے آجکل۔"
"تو کیا صلاح ہے اُستاد ۔۔۔ ؟"
مشین بابو نے یارانہ کرتے ہوئے پوچھا ۔۔۔!
"اب کیا بتاؤں بابو ۔۔۔ ؟" گنّو نے کہا۔ معاملہ سب بگڑ گیا بابو نہیں تو ۔۔۔!
"نہیں تو ۔۔۔۔ مشین بابو نے پانی کی دھار سے جھانک کر پوچھا۔"
"بڑے آنند رہتے۔"
گنّو مسکرانے لگا ۔۔۔!

"اب کوشش کرو — ہم بھی ساجھے دار ہیں تمہارے۔

مشین بابو بولے —!

گنّو نے کہا — ہاں — منظور!

"سچ کہتے ہو گنّو! مشین بابو نے کہا —

اگر لگ گیا داؤں — تو ضرور!

وہ بولا —

بمبے کے پانی میں ریت آنا شروع ہو گئی تھی! مشین بابو بمبے کے نیچے سے ہٹ آئے! گنّو کے ہاتھ ہتھے پر رُک گئے! کیا ہے بابو —؟

کچھ نہیں — ریت آنے لگی پانی میں! رہنے دو! بس نہا چکا!

یہ بمبے بڑے خراب ہوتے ہیں!

گنّو نے جواب دیا!

مشین بابو دھوتی بدلکر اپنے کوارٹر میں چلے گئے! اور گنّو اپنے کوارٹر میں —!

کہاں تو مشین بابو میں انسانیت اور ہمدردی کے جذبے طوفان بپا تھے کہاں یکایک جنسی جذبات نے بغاوت شروع کر دی۔ اب وہ رہ رہ کر یہ سوچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کس طرح "رجنی" کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر گنّو کو اپنا بنا کر اس موقع سے فائدہ اٹھالیں۔ ادھر گنّو نے شیامو کو ملا کر رجنی پر اس طرح قبضہ کر لیا تھا کہ درحقیقت اب وہ اپنے لئے شیامو کو بھی ایک طرح کا کانٹا ہی سمجھتا تھا۔ "رجنی" گنّو کیلئے اتنی بیباک ہو چکی تھی کہ اس کیلئے

شیامو کے وسیلے کی ضرورت ہی نہ تھی! اکثر رات کو اسی برگد کے گھنے سائے کے نیچے گنّو بیڑی پی پی کر اس کی راہ دیکھتا کرتا تھا ــــ اور جب دھندلے دھندلے تاریک سایہ میں بے اختیار حرکت پیدا ہونے لگتی تو وہ جلدی سے اپنی ادھ جلی بیڑی پھینک کر اسی سائے کی طرف بڑھ جاتا ــ نجانے کتنی کتنی دیر دونوں برگد کی داڑھی میں الجھ الجھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے ــ

کئی بار شین بابو نے چھپ چھپ کر، رجنی اور گنّو کی بہت سی باتیں سنی تھیں ــ کیسی باتیں ــ جس کو سن کر ان کے رونگٹے تھرا اٹھتے! جماہیوں پر جماہیاں آنے لگتیں ــــ اور وہ گنّو کی قسمت پر رشک کرتے کرتے رقابت کے حدود تک پہونچ جاتے ــ وہ سوچنے لگتے کہ یہ گنّو ــ ایک چھوٹا ــ اور غریب آدمی! کس طرح رجنی ایسی خوبصورت لڑکی پر قبضہ کئے ہوئے ہے ــــ حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ــــ جوان ــــ اور پھر مالدار! لیکن نہ جانے کیوں رجنی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ــــ اسکو دیکھکر نگاہیں جھکا لیتی! ــــ راہ کاٹ جاتی ــــ گویا ــ نفرت کرتی ہے ــ

بس ــ ــــ!

مشین بابو نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ــــ اندھیرا ہو چکا تھا۔ گنّو نے دھیرے سے اپنے کوارٹر کے دروازے بھیڑے ــ اور دوڑتے ہوئے برگد کی طرف دبے پاؤں چلنے لگا ــــ برگد کی داڑھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لہرا رہی تھی ــ اس نے ماچس جلا کر بیڑی جلائی، برگد کی داڑھی کے ایک موٹے سے بال کو سہارا دیکر کھڑا ہو گیا ــــ مشین بابو بھی چپکے سے اپنے کوارٹر کے باہر آ گئے ــ چھپ کر

گنّو کے قریب ہی برگد کی جڑ کے پاس ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے! ایسے ہی اکثر چھپ چھپ کر انہوں نے دونوں کی باتیں سُنی تھیں ــــ گنّو نے ایک لمبا کش کھینچکر بیڑی بجھا دی ــــ وہ سامنے ہی آ رہی تھی ــــ چند قدم آگے بڑھ کر اس نے اپنے دل کی حرکتوں کو اس کے تیز تیز تنفّس میں گم کر دیا ــــ!

تم آگئیں ــــ رجنی -؟

آج مجھے بڑی دیر ہو گئی ــــ گنّو۔

اس کی سانس اب بھی بے ربط سی تھی!

کیا ہوا ــــ پیاری

گنّو نے پوچھا

کچھ نہیں ــــ وہ بولی ــ دادا کی طبیعت کچھ خراب تھی۔

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے ــ

گنّو نے پھر سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا ـ

"رجنی! وہ مشین والا بابو تم پر بُری طرح ریجھا ہے ـ!

رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا ـ!

بولتی کیوں نہیں رجنی! وہ بولا! مشین بابو تو میرا سا بھے وار ہے ،

کیا کہا تم نے گنّو! کیا میں کوئی بیسوا ہوں! رجنی نے جواب دیا ـ!

نہیں میرا مطلب تم نہیں سمجھیں ــــ گنّو کہنے لگا! وہ بھی اپنا سنگھی ہے!

آخر شیامو ....! وہ بولی!

بس رہنے دو شیامو کو تمہیں نے تو کہا تھا ــــ!

اور بابو کو بھی میں یہی کہہ رہا ہوں! گنتو نے جواب دیا ۔!

چپ رہو ــــ کیا کہتے ہو ــــ اب یہ نہ ہو گا! رجنی نے خفگی کے ساتھ

جواب دیا!

تو آخر ان میں کیڑے ہی کون سے پڑ گئے! گنتو بولا ــــ!

رجنی نے جواب دیا ۔

یہ شہر والے ہیں ــــ ان کی اور ہماری دوستی ہی کیا ــــ؟

گنتو ہنسنے لگا ۔

میں تو مذاق کر رہا تھا تم سے ــــ ہاں اب یہ بتاؤ ۔ تم واپس ۔ کب

چلو گی ــــ؟

اچانک بوڑھے برگد کی داڑھی میں چھپے ہوئے چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ نے

دونوں کو چونکا دیا ــــ مشین بابو سمجھے کہ جیسے ان کی تاک جھانک کا بھید کھل گیا ہے ــــ

برگد کی جڑ سے نکل کر وہ تاریکی میں اپنے کوارٹر کی طرف چلے گئے ــــ!

اللہ کی دین!

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین رکی ہی تھی کہ مسافروں کا ٹڈی دل ٹوٹ پڑا پہلے ہی سے سارے درجہ میں سانس لینے کی جگہ نہ تھی کہ ایک ادھیڑ عمر نیم مولوی قسم کے انسان معہ اپنی تمام گھبراہٹوں اور کنبے سمیت داخل ہونا شروع ہوگئے۔ سیاہ رنگ کے برقعے میں ایک عورت لپٹی لپٹائی اور پون درجن کے قریب مختلف سائز کے لڑکے اور لڑکیاں۔ ایک آدھ بکس، بستر، لوٹا، اور خدا جانے کیا کچھ، سارے درجہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، کھڑکیوں پر آدمی — سامان رکھنے کی جگہوں پر آدمی۔ فرش پر آدمی — عرش پر آدمی حتیٰ کہ پائخانہ کے اندر تک آدمی کھڑے تھے۔ اس کنبے کے داخل ہوتے ہی سب حیرت میں تھے کہ یا اللہ یہ سب لوگ کس طرح اس کمپارٹمنٹ میں سما سکیں گے جہاں ہوا تک آنا مشکل ہو چکا ہے — لیکن تعریف اس کمپنی کی جس نے عمرو عیار کی زنبیلیں بنا کر ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہی نہیں کہ اس لڑائی کے زمانہ میں یہ ٹرینیں حسب ضرورت غیر معمولی طور پر گھٹ بڑھ جایا کرتی ہیں اور ان سیٹ پر جن کے سرہانے لکھا ہوتا ہے "بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ" خود بخود آٹھ آٹھ درجن آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ پیدا ہو جایا کرتی ہے بلکہ لطف یہ کہ ان آدمیوں میں سے کوئی بھی جان بحق تسلیم نہیں ہوتا۔ گویا کہ یہ ہندوستانی ریلوں کا ایک

بہرحال ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، مولانا نے کوشش کرکے اوپر والی برتھ پر ایک صاحبزادے کے لئے اور بھی جگہ نکال لی۔ سارے کمپارٹمنٹ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی مسافر ایک لمبی سی جماہی لیکر اللہ یا رام ضرور کہہ دیتا۔ البتہ مولینا دوسرے کے بعد تیسرے کی فکر کر رہے تھے کہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک خاں صاحب بول اُٹھے۔ غالباً مولینا انھیں کے سامان سفر کی مرمت شکست و ریخت فرما رہے تھے۔

"کیا ارادہ ہے" خاں صاحب نے کہا۔ "ملا جی! کیا سامان پھینکدو گے۔؟"

"جی نہیں" مولانا بولے! "ٹکٹ ہم نے بھی خریدا ہے جناب!"

"دوسروں کا سامان پھینکنے کے لئے" خاں صاحب کا جواب بھی نرم تھا۔

"کچھ ہو صاحب" مولانا نے فرمایا! "لڑکے بھی تو نہیں پھینکے جا سکتے۔"

"تو جہاں جگہ ہو لڑکوں کو بٹھال دیجئے ـــــ مگر سامان" خاں صاحب نے جواب دیا ـــ!

"آپ کے سامان کی ذمہ واری کسی نے نہیں لی ہے" مولانا آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔"

اب معاملہ خاں صاحب کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ آستینیں چڑھا کر کھڑے ہو گئے "لگایئے تو سامان کو ہاتھ"

"دیکھیئے ابھی لیجئے"

"ہاں ـــ ہاں ـــ سامان کو ہاتھ لگایئے"

"ابھی ـــ ابھی ـــ" مولانا دور سے گیدڑ بھبکیاں دکھا رہے تھے۔

"جیسے ساری گاڑی آپ نے خرید لی ہے۔" مولانا کہہ رہے تھے۔!

"اور ـــــ نہیں ـــــ تیرے باپ کی ہے۔" خاں صاحب تو تکار تک آ گئے تھے ـــــ!

"دیکھیے ـــــ دیکھیے ـــــ زبان سنبھال کر ـــــ" مولانا نے تہذیب سے کہا۔

"تیری زبان سمجھا ـــــ" خاں صاحب عنقریب تھا کہ مولانا پر آ جائیں دو چار آدمیوں نے بیچ بچاؤ کر دیا ـــــ اب مولانا کھڑے کھڑے بڑبڑا رہے تھے اور خاں صاحب اپنی طرف اردو کے مغلظات بول رہے تھے۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب بوغالباً یہ سوچ رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں اتحاد و یک جہتی ہو جاتی تو سارا ہندوستان ہندوستانیوں کا تھا۔ اس خاص بین الاقوامی اختلاف کو نہ دیکھ سکے۔ رنگین شیشوں کی عینک سے جھانک کر بولے:

"ملا جی ـــــ آج کل بال بچوں کو لے کر سفر کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔"

گو کہ مولانا کسی دوسرے محاذ کیلئے تیار نہ تھے مگر ڈیفنس تو ہر حال میں ضروری تھا ـــــ جواب دیتے ہیں ـــــ:

"منشی جی ـــــ پھر ان بچوں کو کس جہنم میں جھونک دوں؟"

"جہنم میں جھونکنے کا سوال نہیں" منشی جی کہنے لگے "میرا مطلب یہ ہے کہ آج کل بال بچوں کو لیکر سفر نہ کرنا چاہیے ـــــ"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" مولانا نے جواب دیا "مگر بچوں کو کس پہ چھوڑ آؤں ـــــ تو بغیر بیوی ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے ـــــ"

برابر والی سیٹ سے ایک نوجوان نے دخل درمعقولات کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن صاحب یہ درجنوں لڑکے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی"

سارے درجہ میں ایک قہقہہ بلند ہوگیا۔

"ضرورت کیسی" مولانا منقولات پراُتر آئے۔ یہ تو خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے، معاف کیجئے گا۔ آپ کے معلوم ہوتا ہے ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ورنہ ——!

"ورنہ ——" نوجوان نے بات کاٹ کر کہا "ورنہ ضرور خودکشی کر لیتا میں ——"

سب لوگ پھر ہنسنے لگے۔ مولانا کچھ جھینپ سے گئے۔ بولے!

"عزیزم! جب ہی تو آپ کو اولاد کی قدر نہیں ہے —— یہ اللہ کی دین ہے۔ اللہ کی دین ——!

یکایک ایک زور کے دھچکے سے گاڑی ٹھہر گئی —— سب لوگ درجہ سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے کہ ماجرا کیا ہے ——؟

لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ ہانپتے کانپتے گارڈ صاحب تشریف لائے۔

"زنجیر کھینچی گئی ہے"

ہم لوگ حیرت میں تھے ——

"یہاں تو کسی نے زنجیر نہیں کھینچی"

"ضرور کھینچی کسی نے" گارڈ نے کہا۔

ہم لوگ اپنی اپنی طرف نظر اٹھا کر یہی دیکھ رہے تھے کہ گارڈ نے داخل ہوتے ہی کہا، "وہ دیکھئے"

اب جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو مولانا کے ایک صاحبزادے یہ فرض انجام دے کر اپنی کامیابی پر مسکرا رہے تھے۔

بچہ کی شرارت تھی لیکن پھر بھی گارڈ نے مولانا کا نام و پتہ مع مکمل ولدیت کے دو دیگر لوگوں کا نام و نشان نوٹ کر لیا۔ خدا خدا کر کے ٹرین روانہ ہوئی۔

گاڑی چلتے ہی نوجوان نے پھر مولانا کو چھیڑنا شروع کیا۔ لیکن ولدیت وسکونت لکھ جانے سے مولانا کچھ ایسے گھبرائے تھے کہ ایک لفظ بھی نہ بولے۔

کوئی پانچ ہی منٹ کے بعد ٹرین پھر آہستہ ہونے لگی۔ ہم لوگوں کا خیال ہوا کہ کہیں پھر تو چین نہیں کھینچ لی چھوٹے مولانا نے۔ لیکن یہ بات نہ تھی بلکہ ایک اسٹیشن تھا، ہندو پانی، مسلم پانی، پوری مٹھائی والے چیخ رہے تھے۔

گاڑی کا رکنا تھا کہ مولانا کی محترمہ نے پھر تیسرے بڑے کا سٹ کیا۔ "اے اے میں کہتی ہوں سنتے کیوں نہیں۔ چنو کیلئے ایک جھنجھنا لے لو۔"

مولانا ابھی محترمہ کا میسج لے ہی رہے تھے کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اچھے ابا کیلے لیں گے۔"

"اماں جان گڑیا لے دو۔"

اللہ کی دین نمبر ۳ نے فرمائش کی، "اچھے ابا گیند، ویسا ہی جیسا مسعود کے پاس ہے۔"

مٹھائی بسکٹ، اللہ کی دین ہے نے کہا۔

اوپر کی برتھ پر جو صاحبزادے تشریف رکھتے تھے ہکلا کر بولے ۔

ہم بھی لے دیں ابّا ۔ (ہم بھی لیں گے ابّا ۔)

مولانا ہکّا بکّا ہو ہو کر سب کو تسلّی دے رہے تھے ۔ دراصل وہ بیچارے زنجیر کھینچنے کے واقعہ سے کچھ اتنا گھبرائے تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا شائد اُن کا خیال تھا کہ اب مقدمہ ضرور چلیگا ۔ اور اگر پھانسی نہ ہوئی تو جیل ضرور ہو جائے گی مجھے نابالغ بچّہ کا میں ولی ہوں نا ۔!

ابھی مولانا اسی اُلجھن میں بیوی بچوں کو تسلّی دے رہے تھے کہ ناگہاں اوپر کی سیٹ پر لیٹے ہوئے سب سے چھوٹے بچّے نے چونک کر رونا شروع کر دیا ۔

"قدّا کفو کو" بچہ کی ماں بولیں "اوپر سے اٹھالو"

"اجی کہاں اٹھاؤں" مولانا نے بگڑ کر کہا "دیکھتی نہیں ہو کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہے، رونے دو ۔ استغفراللہ ۔!

"کہیں کسی پر پیشاب نہ کر دے" وہ بولیں ۔

"پیشاب کیا کر دیگی" مولانا نے جواب دیا "کیا پیشاب کرایا نہیں تھا"

"کرایا تو تھا ۔ مگر شائد" بچوں کی ماں بولیں "اُٹھالو"

"خاموش رہو کیوں بیکار جھک جھک لگا رکھی ہے" مولانا بولے !

اب "کفو" اور بھی چیخنے لگی ۔ محترمہ کے بے انتہا اصرار پر مجبور ہو کر مولانا نے لڑکی کو گود میں اُٹھالیا ۔ اب کی بیگم صاحبہ بولیں ۔!

"پیشاب کرالو" ۔!

" بیکار کہتی ہو" وہ پیشاب نہیں کرے گی، مولانا نے کہا۔

بیگم صاحبہ نے کئی بار کہا مگر مولانا نے سنی ان سنی کر دی۔ لڑکی بدستور روتی رہی تھی اور مولانا گود میں لیے ہوئے چمکارہے تھے۔ یکایک مولانا کے پاس بیٹھے ہوئے مسافروں نے کچھ ترادٹ محسوس کی۔ ایک مہاشے جی نے جن کی گردن پر کئی قطرے ٹپک گئے تھے، نظر اٹھا کر دیکھا تو رام رام کہہ کر چیخ اٹھے۔ پاس پڑوس کے دو چار آدمیوں نے مزید جستجو شروع کی تو معلوم ہوا کہ مولانا کی نعوباپ کی آغوش محبت میں حاجت ضروری سے فراغت کر چکیں۔ کچھ عجب عالم تھا اس وقت کا سب لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔

اور مولانا کی شیروانی سے پائجامہ تک یہ حال تھا کہ

میانی تک بڑھا کے لیگیا چاک گریبان کو۔

ان کے سب کپڑے "گو" اور موت" میں لت پت تھے اور جمال ہمنشین پاس پڑوس پر ...ی اثر کر چکا تھا۔

جیسے تیسے مولانا اور ان کی محترمہ پائخانے تک پہنچائی گئیں کوئی دس منٹ تک مولانا اور ان کی محترمہ ان غلاظتوں کو دھوتی رہیں۔ خدا خدا کر کے مولانا اپنی جگہ پر آ ہو بیٹھے کچھ جھینپے ہوئے سے مضطرب سے۔

کئی کئی چھوٹے چھوٹے اسٹیشن پاس ہوگئے مولانا بار بار لوگوں کو آئندہ اسٹیشن کے لئے ہدایت دے رہے تھے اور ان کی محترمہ بدستور پائخانہ کے اندر۔

پائخانہ کے پاس بیٹھے ہوئے کئی مسافروں نے جب پائخانے کے اندر سے کراہنے کی آوازیں سنیں تو مولانا کو اطلاع دی گئی کہ آپ کے گھر میں آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔

مولانا کے پائخانہ میں داخل ہوتے ہی بچوں کی ماں زیادہ کراہنے لگیں۔ ان کی تکلیف منٹ

منٹ پر چڑھ رہی تھی ـــــ درجہ جرے تمام مسافر چنی پنی جگہ پر پریشان و سراسیمہ سے نظر آرہے تھے کہ راہی کیا ماجرا ہے خدا جانے بیچاری کو کیا تکلیف ہے۔
پچھتانے سے کرنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ مولانا کی بھی آوازیں آرہی تھیں ۔
"تھوڑی دیر ٹھہر واسٹیشن آجائے تو کوئی تدبیر کروں ۔ اگر یہی صورت تھی تو تم نے پہلے کیوں نہ کہا ۔ میں لاتا ہی کیوں ایسے ہی حالت میں تم کو ۔ بڑی مشکل ہے مصیبت میں جان کردی ہے تم نے ، موت بھی نہیں آتی مجھکو اور تم کو "
لمحہ بہ لمحہ کرب و اضطراب بڑھتا ہی جارہا تھا کچھ عجیب حالت تھی ماں کی تکلیف سن سن کر بچے الگ رو رہے تھے اور خود مولانا قریب تھا کہ داڑھیں مار مار کر چیخنے لگیں ـــ خدا خدا کر کے کراہنے میں کچھ کمی ہوئی ۔ مولانا گھبرا کر پائخانہ سے باہر نکل آئے بُری حالت تھی ان کی بغیر پوچھے ہوئے آپ ہی کہنے لگے ۔
"عجیب مصیبت ہے صاحب ، ولادت ہوگئی ہے ان کے یہاں "
ہم لوگ حیران تھے کہ اب کیا ہوگا ۔ سفر کا معاملہ ۔ ایسی حالت ، خدا ہی رحم کرے ـــ مولانا کے بچے بھی پریشان و سراسیمہ تھے ـــ اور خود مولانا مبہوت و ساکت کئی منٹ تک یہی کیفیت رہی کہ ٹرین آہستہ آہستہ ایک اسٹیشن کے پہلو میں ٹھہر گئی جاکر ـــ !!

لڑائی کے بعد

اگر خدا نے چاہا تو انشاءاللہ! لڑائی کے بعد.........؟
بس دو بول ۔ صلو ۔ کے پڑھوا دوں گی۔ ارے بیوی آج کل لڑائی
کے زمانہ میں تو کچھ ہونا بالکل ناممکن ہے ۔ اب تمہیں دیکھ لو کپڑا ہے کہ ہاتھ ہی نہیں
رکھنے دیتا ۔ ململ اور تنزیب کا تو ذکر ہی کیا ۔ یہ موا کھاردا جو ڈھائی آنے گز بکتا تھا۔ اب
آٹھ دس آنے میں بھی نصیب نہیں ۔ مارکین، چھالٹین، بابا سول ہے۔ آنکھ
کا نشہ ۔ دل کی پیاس اتنی ہی میری مرضی تو اس لڑائی کے زمانہ میں خریدنا ہی پوچھو
نہ میرے بس کی بات ہے نہ خرید سکتی ہوں ۔ موٹا جھوٹا جو کچھ میسر ہے گاڑھا
گزی پہنا کر بچوں کا تن ڈھانک رہی ہوں ۔ اس پر بھی یہ حال ہے منے میاں اللہ
رکھے ہر آٹھویں دن ایک پاجامہ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں ۔ باہر ڈیوڑھی کا دروازہ
تو تم نے دیکھا ہوگا ۔ اس میں دو تین لوہے کی میخیں نکل آئی ہیں ۔ تیسرے دن ان کا
پاجامہ اس میں الجھ جاتا ہے ۔ روز سیتی ہوں روز پھاڑ ڈالتے ہیں ۔ ناک میں دم ہے
بس آٹھ دن تین کپڑوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ دور از حال، شرک کے چیتھڑے لگنے
فقیر چھتے اور یہ نہیں چھتے ۔ ادھر مالک مکان کا یہ حال کہتے کہتے زبان سوکھی جاتی
ہے کہ ذرا پیسے خرچ کر کے دروازہ کی مرمت کرادو۔ مگر ایک نہیں ۔ ہزار نہیں ۔

مرمت کرانا تو جیسے یہ لوگ جانتے ہی نہیں ۔ گائے پالی ؛ دودھ دوہ لیا ۔ نہ چارہ ـــ
سے مطلب نہ پانی سے ۔ غرض ؛ بس جو بارہ پہلی تاریخ آئی ۔ جمعرات کے فقیروں کی طرح
کھڑے ہیں ـــ ؛ اللہ بھلا کرے ؛ دو روپے کرایہ ۔ اگر خدانخواستہ کرایہ میں گھڑی بھر
کی بھی دیر ہو گئی تو اللہ دے بندہ لے ـــ ؛ مکان خالی کرا لینے کی دھمکی ۔ عذاب میں
جان ہے بہن ۔ اول تو سنو روٹی کی حقیقت ہی کیا ؛ پھر یہ مہنگائی ـــ اللہ ہی سفید
پوشی قائم رکھے تو رہے ! روپیہ کا تین سیر آٹا ہے وہ بھی خالص گیہوں کا نہیں ؛ دو
سیر کی دالیں ، چاولوں کی صورت کو ترس گئی ۔ اول تو اچھے چاول ملتے ہی نہیں ، اور جو
ملتے بھی ہیں تو وہ دو سیر ڈھائی سیر کے ! گوشت روپیہ بارہ آنہ میں ۔ ترکاریاں اللہ
تیری پناہ ـــ شکر وہ سیر آدھ سیر سے زیادہ نہیں ملتی ! لکڑیاں چولہے میں جائیں ۔
گھر کے تمام پلنگ اور کرسیاں جلا دیئے ـــ آنکھ میں لگانے کو بھی ایندھن میسر
نہیں ـــ ایسی نفسی نفسی تو میں نے آج تک دیکھی نہیں ! اگر یہ پیٹ کا دھندا نہ ہوتا تو میں اس
گھر بار کو آگ لگا کر ان سے کہتی چلو کسی گاؤں میں بس رہیں ! جہنم میں جائے یہ آفت پٹیا
ہٹلر دنیا کا سکھ چین سب کمبخت نے چھین لیا ـــ گور میں کیڑے پڑیں اس کے ـــ آمین !
میری آنکھوں میں خاک ، صلو کا بیاہ ! اللہ میرا جانتا ہے کیا کیا ارمان لئے
بیٹھی ہوں اپنی صلو کو پروان چڑھتے دیکھنے کیلئے ! میرا بس چلتا بہن تو میں دکھیاری
ماں ساری دنیا کی دولت سمیٹ کر اپنی بچی کے قدموں تلے بچھا دیتی ! کوئی گہنا ـ کوئی
زیور ـــ ایسا نہیں تھا جو جہیز میں دینے کیلئے نہ سوچتی ہوں ـــ جہانگیری پازیب ـ
بازو بند جھمکے ـــ اور راج ـــ کنگن ـــ کرن پھول ـــ چمپا کلی ـــ سب سونے کا
جڑاؤ دوں گی ـــ کپڑوں کے لئے تو یہ طے کر چکی ہوں کہ ایسے ہوں گے کہ دنیا کہہ دیگی

کہ خواجہ صاحب کی پوتی کا بیاہ تھا۔ باقی جہیز کے بارے میں وہ ذرا مخالفت کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں جہیز وہیز کا سخت مخالف ہوں۔ یہ سب جہالت کے ڈھکوسلے ہیں۔ جو کچھ دینا ہے نقد لڑکی کے ہاتھ میں دیدو۔ خلاف تو وہ زیور گہنے کے بھی تھے۔ مگر میرے بہت سمجھانے بجھانے پر مان گئے۔ آگ لگے موئے اس فیشن کو جسے دیکھو بے دین اور لا مذہب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نہ اللہ سے واسطہ نہ رسول سے غرض۔ یہ جہالت۔ وہ جہالت۔ بڑے بڑے چندے دینا! بائسکوپ اور تھیٹر دیکھنا بس یہی رہ گیا ہے۔ اللہ جانتا ہے جب سے یہ آفت پیٹے اخبار چھپنے لگے جبھی سے یہ نحوست دنیا پر چھاگئی۔ روز روز کا بے تکان جھوٹ اللہ ہی ہے جو آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔ آج فلاں جگہ لڑائی ہوگئی فلاں جگہ جھگڑا ہوگیا۔ آج یہاں بلوہ ہوگیا کل وہاں۔ پرسوں گائے کے پیٹ سے ہاتھی کا بچہ پیدا ہوا۔ یہ ہوا وہ ہوا۔ تمہیں یاد ہے جب تک یہ اخبار نہیں تھے۔ نہ کانگریس ہوتی نہ لیگ آئی۔ نہ گاندھی پیدا ہوئے نہ جناح۔ نہ ہندو مسلمانوں میں جھگڑے ہوئے۔ سب امن چین سے رہتے تھے۔ نہ کوئی جھگڑا تھا نہ کوئی بکھیڑ۔ اور اب تو سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ بھلا تمہیں خیال کرو کہاں ہماری سرکار اور کہاں جرمنی کے کفن کھسوٹ! شیر اور گیدڑ کا کون مقابلہ۔ یہ سب اخباروں کا جھوٹ ہے جو کہتے ہیں کہ ہٹلر نے کوئی ملک جیت لیا ہے۔ خدا لگتی تو سچ پوچھو ہی ہے کہ ان موئے جھوٹے سچے اخباروں کو پڑھو ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں میں نے تو ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے گھر میں یہ جھوٹے سچے اخبار جو تم بیکار لاتے ہو تو بس اچھا نہ ہوگا۔ تم کو اگر جھوٹ سچ پڑھنا ہی ہے تو منحوسیت دہلیز کے باہر رکھو۔ مجھے گھن آتی ہے۔ ابھی دو برس کی بات ہے

جب وہ لڑکی پیدا ہوئی تھی ان کے کسی دوست نے اخبار میں مبارک باد چھپوادی ہے" بہت خوش خوش گھر میں اخبار لیکر آئے ــــ پھر کیا ہوا دیکھ لیا تم سب نے! کیسی بھولی بھالی تھی۔ اللہ نے بلالی ــــ میرا تو کلیجہ لرز جاتا ہے جب دیکھ لیتی ہوں اخبار کو ننھی بچی کی صورت آنکھوں تلے پھرنے لگتی ہے ــ

ہاں تو کہہ رہی تھی کہ بس لڑائی ختم ہونے کے بعد ہی ارادہ ہے کہ اس کا نکاح کردوں پیام تو کئی آئے! لیکن بہن ــ تم جانتی ہو کہ یہ زندگی زندگی کا ساتھ سابقہ ہے! ایسے معاملے میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوں ــــ آج کل کے لڑکے ــــ! توبہ ــــ توبہ ــــ میرے سامنے ابھی خود دو پہاڑ ہیں۔ نہ جانے کیا مقدر میں لکھا ہے۔ مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے ویسا ہی کہلاتا ہے ــ مجھ کو تو اس زمانے کے طور طریقے خاک نہیں بھاتے! ایک آنکھ نہیں بھاتے! یہ چودھویں صدی نوج لوٹ کر آئے! میاں نے بیوی کا گھونگھٹ اُٹھاتے ہی ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ بائیسکوپ، تھیٹر، سرکس، ہاٹ بازار، کچہری دربار، بندریا کی طرح لئے پھر رہے ہیں۔ نہ پردہ، نہ برقعہ، غیرت و شرم کا نام ہی نہیں! وہی میموں کا ایسا پہناوا۔ اونچی ایڑی کی گورگابیاں ــ اُلٹی مانگ ــ اللہ جانے اس زمانے میں کیا ہو گیا ہے کہ موئی کسبیوں اور بیویوں میں کوئی فرق نہیں رہا ــــ! اے ہے یہ آج کل لڑکے نہیں باپ پیدا ہوتے ہیں۔ باپ کی بوڑھی روڑھی ہڈیوں پر روز روز نت نئے فیشن نکالتے ہیں۔ داڑھی تو اصل خیر سے اس زمانے میں فیشن پر بھینٹ چڑھ ہی چکی ہے۔ ٹھاٹھ باٹھ بھی بالکل عورتوں جیسے بدلتے چلے جا رہے ہیں! میں نے تو ارادہ کر لیا ہے چاہے میری صلو تا یہ زندگی یوں ہی کنواری پڑی رہے۔ مگر کروں گی تو کسی گھر کا ذ

کے لڑکے سے، جو حسب نسب، چال چلن، طور طریقوں میں برابر کا ہو، نہ مجھ کو دولت
چاہیے نہ گاؤں گراؤں — بس کھاتا پیتا گھر ہو، دال روٹی سے مزے میں ہو —
لڑکی سکھ سہاگ سے رہے، میرے لئے یہی سب کچھ ہے —!

۲

بشیشور: کی مرضی ہے تو لڑائی کے بعد —!
گنگا کی قسم کھا کر کہتا ہوں منیم جی — لڑائی کے بعد کم سے کم دس ملیں کھلنے کی
ضرور کوشش کروں گا — یہ لڑائی اور سب طرح سے تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اگر ہمیشہ ہوتی
رہے تب بھی لالہ کوڑی مل کو کچھ شکایت نہ ہوگا۔ فکر ہے تو بس اتنی بات کی کہ لڑائی
کی وجہ سے بدیشی مشینیں آنا بالکل بند ہو گئی ہیں —

چاول آٹے اور تیل کی مشینیں اب اتنی پرانی ہو چکی ہیں کہ روز روز بگڑتی رہتی
ہیں — اگر ٹھیک ٹھاک سب مشینیں چلتی رہیں تو روزانہ کم سے کم دو من آٹا اور تین سو روپیہ
کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ آٹے کی پسائی تو تم دیکھ رہے ہو روزانہ کتنی بڑھتی چلی جا رہی
ہے!

مگر کنٹرول والوں کا ڈر نہ ہوتا تو تیس چالیس لاکھ روپیہ کے قریب گیہوں میں
فائدہ ہو جاتا — جب پندرہ سیر کے تین روپے بکتے تھے۔ میں نے پانچ لاکھ روپیہ
کا سودا کیا تھا جس کی قیمت اب آٹھ گنی ہو چکی ہے — اگر مہنگائی کا یہی حال رہا تو بشیشور
چار بیگھ پچاس لاکھ روپے کا مال ہو جائیگا۔۔ ذرا خیال رکھنا دن نہ لگ جائے —!
میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ سو دو سو آٹے پر بھی اگر کہیں کا روپیہ بچ جائے

تو نہ چھوڑو۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے دو ہی چار دن میں کئی چاندی گلانے والے سنار آ جائیں گے۔ یہ روپیہ گلوا کر ان سب کی چاندی نکلوا لو۔ پچھلے سال تم دیکھ چکے ہو ملکہ کی چاندی کا بھاؤ کتنا بڑھ گیا تھا۔ یہی حال رہا تو ملکہ کی چاندی دونے بھاؤ چڑھ جائیگی۔

اب کی سمت بدلتے ہی سب پرانے کھاتے بدکے نئے بنا ڈالنا۔ لاکھ دو لاکھ سے زیادہ کی جمع خرچ مت دکھانا۔ یہ روز روز کے ٹیکس اور لڑائی کے چندے کہاں سے دیئے جائیں گے۔ اس دن ڈپٹی صاحب نے بلوا بھیجا تھا۔ پچاس مانگ رہے تھے پچاس۔ تم ہی بتاؤ اگر اللہ کوڑی مل پچاس پچاس روپیہ چندہ دینے لگے تو لڑائی سے پہلے ہی دیوالہ نکل جائیگا۔ میونسپلٹی کے چیرمین آئے تھے اس دن! کہتے تھے کہ کلکتہ میں قحط پڑ گیا ہے سیٹھ۔ سب لوگ فاقوں مر رہے ہیں کچھ مدد کرو۔ چندہ دو۔ ! میں نے کہا میرے پاس کیا دھرا ہے جو کلکتے اور بمبئی مدد کرنے جاؤں۔ میرے دروازہ پر خود ایک چھوڑ دو گائیں بندھی ہوئی ہیں انہیں کا چارہ پانی مشکل ہے۔ تم لوگوں کو چندہ کی پڑی ہے۔ بھگوانے کتنے جہاز وزہرہ سرکار غلے کے بھیج رہی ہے۔ اور کلکتے والے ہیں کہ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور پھر اگر ان کی اسی بہانے لکھی ہے تو کیا چندوں سے موت کی گھڑی ٹل جائیگی۔؟

چندہ، چندہ، چندہ۔! جدھر دیکھو یہی سنائی دیتا ہے جیسے سیٹھ کوڑی مل نے دنیا کی "سنبھاؤل" کا ٹھیکہ ہی لے رکھا ہے۔ شہر بھر کے تمام گؤشالے، دھرم شالے۔ اناتھالے۔ پاٹھ شالے سبھی ہیں تو چار چار آنے ماہوار چندہ دینا پڑتا ہے۔ پھر آخر اپنا بھی کوئی دین دھرم ہے۔ پوجا پاٹ، ستنارائن کی کتھا۔

ایکادشی کے برت، نیم جی سب کچھ کرتا ہوں ۔ اب بھی اگر ۔ نرک میں جانا میرے بھاگ
ہی میں لکھا ہے تو اس کو میں کیا کروں ۔

ہاں ۔ ! سنتے ہو ریزگاریوں کا بھاؤ روز بروز چڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ اب ایک
روپیہ کی دس آنے ہو گئی ہے ۔ ذرا ہاتھ روک کر کام کرنے کی ضرورت ہے بھگوان
نے چاہا تو چند دنوں میں گھٹ گھٹا کر آٹھ آنے تک آیا چاہتا ہے بینک کے بابو
سے مل کر ذرا بات چیت کر دو ۔ اگر وہ پچاس ہزار روپیہ کی ریزگاریاں دلوا دیں تو نقد
پچاس روپیہ دوں گا کوشش کرو شاید آ جائے راستے پر ۔

مونگ پھلی کے مل والے آج کل بہت ہتر بچار رہے ہیں کہتے ہیں یا تو مہنگائی
کا بھتہ دو یا پھر تنخواہ بڑھاؤ ۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ یہ سب کچھ آج کل لڑائی
کے زمانہ میں ہونا مشکل ہے ۔ محنت کرو اور جان توڑ کوشش کرو تو لڑائی کے بعد
کتنی روپیہ کے حساب سے تنخواہ بڑھا دوں گا ۔ ہونہہ یہ سب سمجھتے ہیں کہ اگر ہم لوگ
کام چھوڑ کر چلے جائیں گے یا ہڑتال کر دیں گے تو مالک کو آدمی نہیں ملیں گے ۔ یہ جانتے
نہیں کہ اگر سیٹھ گوڑی مل بڑے لاٹ صاحب کو سلام بول دیگا تو کرانچیوں میں بھر کر
آدمی کلکتے سے آ جائیں گے ۔ بیچارے بھوکوں مر رہے ہیں ۔ کھانے کپڑے پر یہ سودا
کچھ مہنگا نہ ہو گا ۔ پھر اپنے یہاں تو بابا اور دادا کے وقت سے ۔ سدا برت ۔ جاری
ہے ۔ ابھی اس دن پانچ سادھوؤں کو پاؤ پاؤ بھر آٹا میں نے دلوایا تھا ۔ یہی کیا کم ہے
پاؤ بھر آٹا آج کل دو آنے کا ملتا ہے پانچ دونا دس آنے اسی طرح ہو گئے ۔ سال بھر
میں ایسے ایسے دس پانچ خرچے ہو جاتے ہیں ۔ نیکیوں کی بھلائی سے بھگوان بھی
خوش ہوتے ہیں ۔ قحط پڑ گیا ہے بیچ ۔ ۔ تکلیف میں ہیں میرا کام کریں گے اور مزے

سے کھائیں گے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو بھی مجھے کیا کمی ہے! پندرہ ہزار سے کچھ زیادہ ہی اسامی ہیں۔ اکنّی روپیہ سود پر میں نے سب کو روپیہ دیا ہے غریبوں پر دیا کرنا ہی پڑتی ہے کیا کروں بیچارے بھوکوں مر رہے تھے دین دھرم سمجھ کر اکنّی روپیہ سود ہی پر دے دیا۔ ورنہ بیاج تو آج کل بہت ہے — اگر میں ان لوگوں سے کہہ دوں کہ بھائیو! ایک ایک مہینہ میری مل پر کام کر دو میں سود چھوڑ دوں گا۔ تو رام جانے ایسی ایسی پانچ ملیں اور کھول دوں — تب بھی آدمیوں کا ٹوٹا نہ ہو! چھوٹے منیم جی! مجھے تمہارا بڑا خیال ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے تم کو یہی سوچ کر دس روپے مہینہ پر نوکر رکھا تھا کہ روز روز کی تنخواہ گھٹانے بڑھانے کا جھنجھٹ ہی نہ رہے۔ ورنہ یوں تو آٹھ روپیہ پر بھی آدمی مل رہا تھا۔ مگر سچّی بات تو یہ ہے کہ رستا رونے بار بار مہنگا رونے ایک بار "یہی خیال کر کے میں نے ایک دم سے دس روپیہ مقرر کر دیئے تھے۔ کہ آئے دن کا جھگڑا نہ رہے۔ تم خود دیکھ رہے ہو آجکل دنیا بھر کے روزگار ٹھپ پڑے ہوئے ہیں۔ سوائے گھاٹے کے نفع کا نام ہی نہیں۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ سونا چھوتے ہی تو مٹی ہو جاتا ہے — کھانے پینے سے الگ تکلیف — ایندھن ملتا ہی نہیں مصیبت میں جان ہے۔ تم کہتے ہو تنخواہ بڑھاؤ — میں خود اپنے دُکھ میں پھنسا ہوا ہوں — تم کو اپنی پڑی ہے۔ محنت کرو — بھگوان کی اچھیا ہے تو لڑائی کے بعد کچھ تنخواہ ضرور بڑھاؤں گا۔

——٭——

بیشک اگر احسان کا بدلہ نقصان ہی ہے تو میں نے سچ مچ یہ بہت برا کیا
جو اپنے کوٹھے کا دروازہ نیچے کرایہ داروں کے پانی لینے کیلئے کھول رکھا تھا ——
کیوں کہ قریب میں میرے کوٹھے پر نل کے علاوہ اور کہیں آسانی سے پانی نہیں مل
سکتا تھا۔ پھر میرا ہرج ہی کیا اگر زینے کا دروازہ بند بھی نہ کروں تو بھی میرے کمرہ
کا تمام سامان حفاظت ہی سے رہتا۔

میری منہمک زندگی — مختصر سی ضرورتیں — خاموش اور پرسکون
تنہائی — مجھے اس کا موقع ہی کب تھا جو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ نیچے گلی
کی کوٹھریوں میں کتنے کرایہ دار ہیں آج کل —— کیا نام ہیں ان کے ——
سڑکوں پر تانگوں اور موٹروں کی رفتار دھیمی کرنے والے کتنے میلے کچیلے
بچے انہوں نے پیدا کئے —— یہ لوگ کیا کرتے ہیں —— ان کی تنخواہیں کیا
ہیں وغیرہ وغیرہ —— ؟

سویرے اٹھنا منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے کے لئے ہوٹل جانا ——
پھر کھانا —— دکان —— سہ پہر کو ٹہلنا، کھانا —— پینا —— کچھ پڑھنا۔
اور سو رہنا —— بقول منٹو صاحب کے میری زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کے

پڑھتے پڑھتے "جینئیس" ہو جاؤں —
کبھی کبھار چھٹی کے دن جب کہیں "اسٹیڈی" کیلئے نہ جاتا تو بھی میرا کمرہ تمام دن اندر سے بند ہی رہتا — کیونکہ کمرہ کے باہر مختصر سے صحن میں برتنوں کے مانجھنے کی پیہم کھڑکھڑاہٹ — بیدری کے ساتھ نل سے بہتے ہوئے پانی کی شرشراہٹ — اور پھر نیچے رہنے والی عورتوں کی بے جوڑ اور گندی باتیں — میرا دماغ پکا دیتیں —

"سوکھی لکڑی ملتی ہی نہیں" —؟

"مرلی کی بوا — کیا پکایا آج"

"جانے رامو کی بہو کے لڑکا کب ہوگا — دن تو پورے ہو چکے"

"دو دن سے نل بہت جلدی ہی بند ہو جاتا ہے"

"یہ بابو بھیتر سے کمرہ کیوں بند کر لیتے ہیں — نہ جانے کیا بات"

"تونے سنا — ری — بھوجی — گنگا کی دلہن بھاگ گئی — اس ڈرائیور کے سنگ"

"اسپتال میں بھرتی ہو جاؤ —"

"پنجاب میں بیچ دیگا — چھی — نا — کو"

"دیکھ — اتیرے دھودر نے کیسا مارا ہے — میرے شیامو کو"

"نمبے کا جی چھوڑ — چل — ہٹ"

"کیا کوئی چٹھی نہیں آئی —"

"چھ — چھ — چھ — لام پر چلا گیا دکھیا؟"

میرے کوٹھے کے صحن پر اکثر اسی قسم کے معاملات چھڑے رہتے۔ یہ
گندی قسم کی غلیظ اور بے علم کثیف عورتیں زیادہ تر میرے کوٹھے کو۔ ادھر کے کھیت
اور پنگھٹ، کی ان رومانٹک ضروریات کے طور پر استعمال کرتیں جو اکثر اسی قسم کی
باتوں کیلئے مخصوص ہوتے ہیں اور جن کو ان لوگوں کا۔ دارالعوام، کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اور
میں نے آج تک کبھی بھی ان کے اس تکلیف دہ آرام میں کوئی مزاحمت یا دخل اندازی نہیں
کی۔ حالانکہ مکان کا مالک ہر مہینے مکان خالی کر دینے کی دھمکیاں ہی دیا کرتا۔

۔ صاحب ــــ سارا دن آپ کا بمبا ــــ بند ہی نہیں ہوتا ــ چھت

پھٹی پڑتی ہے!۔

۔ آپ اپنا دوسرا انتظام کر لیجئے ــــ مجھے خود مکان کی ضرورت ہے۔

۔ نیچے زینے میں قفل کیوں نہیں لگا دیتے؟

۔ تو میں کیا کروں ــــ آپ پانی نہ لینے دیجئے۔

۔ جناب روز ــــ روز ــــ نل کی مرمت نہیں ہو سکتی۔

میں سخت عاجز تھا کہ مالک مکان کو کس طرح سمجھاؤں کہ پانی جیسی کم
قیمت چیز بند کرنیوالا۔ یزید۔ ہو جایا کرتا ہے ــــ آپ نے نیچے کرایہ دار تو ٹھہرا رکھے ہیں
ــــ لیکن ان کے پانی کا کوئی انتظام نہیں کیا ــــ صرف کرایہ ہی لینا جانتے ہیں آپ
چاہے مجھے گھر خالی کر دینا پڑے ــــ مگر قفل لگا کر پانی بند کر دینا میرے بس کی
بات نہیں ــــ

ان سب باتوں کے باوجود کبھی کبھی نرمی سے سمجھانا بھی پڑتا۔

۔ دیکھو تم لوگوں نے نل کا ستیاناس کر دیا ہے ــ اگر زیادہ گڑبڑ

کردگی تو جانتی ہو مجبوراً مجھکو زینہ میں قفل لگانا پڑے گا۔ سن لیا تم سب نے۔
سب عورتیں اپنی اپنی صفائی دینے لگتیں ـــــ جیسے یہ سب کچھ ان لوگوں کا کیا دھرا نہیں ہے۔
"نا ـــ بابو ـــ نا ـــ میں نے کبھی بمبا خراب نہیں کیا ـــ وہ جو آتی ہے ـــ راجو کی ماں اس کا سب قصور ہے ۔"
"ہاں ـــ وہی تو بمبا کھلا چھوڑ جاتی ہے ـــ
"اور مالن کے لڑکے بھی تو سارا دن پانی سے کھیلا کرتے ہیں ۔" ـــــ
ـــ نا بھوجی ۔
"سرجو کی بہن نے تو اس دن بمبے کا پیچ نکال ڈالا تھا ۔"
"ہاں ـــ بابو ـــ وہ رانی تو اس دن اس کوٹھری میں نہاتی ہے ۔"
غسلخانے کی طرف اشارہ کرکے ایک عورت نے کہا سچ مچ میرے غسلخانے میں کیسی غلاظتیں دھوئی جاتی ہیں ۔ میرے تن بدن میں چنگاریاں چھوٹنے لگیں ۔ اللہ کی شان ـــ اب میرا غسلخانہ ان بیڈھنگی ـــ گندی ـــ اور غلیظ عورتوں کیلئے ہو گیا ـــ جی چاہتا تھا کہ فوراً ہی اس منحوس اور گندے گھر کو آگ لگا دوں ـــ اور اس غسلخانے کی اینٹ اینٹ کھود کر پھینک دوں ۔ ہر مہینے کرایہ دے کر باتیں میں سنوں ـــ اور غسلخانے میں نہ جانے کس قسم کی غلیظ اور گندی کثافتیں دھوئی جائیں ـــ گویا میرا گھر نہ ہوا بھٹیاروں کی سرا ٹھہرا ـــ زمانے بھر کی آلائشیں ـــ دنیا بھر کے روگ ـــ گندگی ـــ میرا جی متلانے لگا ـــ

میرے کہنے سننے کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ دو چار روز تک کچھ احتیاط سے
استعمال کیا گیا ۔۔ برتن دھیرے دھیرے مانجھے گئے ۔۔ باتیں آہستہ آہستہ
ہوئیں ۔۔ اور بلا در وانے کا غسلخانہ صاف و ستھرا رہا ۔ لیکن ہفتہ ہی بھر کے بعد
یکایک یہ معلوم ہوا جیسے میرے خلاف سخت "ایجی ٹیشن" یا "ستیہ گرہ" شروع
کردی گئی ہے ۔۔ پھر وہی رفتار ۔۔ نہایت باقاعدہ طریقے پر بے احتیاطی کے ساتھ
پانی پوری دھار چھت کی ٹنکیاں سے گرتا ہے ۔۔ برتنوں کے دھونے مانجھنے
کے علاوہ بدتمیزی درخت کی مرمت بھی ہونا شروع ہوگئی ۔ نہایت ہی میلی
کچیلی ساریاں ۔۔ اور غلیظ دھبوں میں ڈوبی ہوئی دھوتیاں ۔۔ بدبودار
کرتیاں اور شلوکے ۔۔ اور نہ جانے کس کس قسم کے انگھے کپڑے میری الگنی
پر پھیلائے جانے لگے ۔۔ اور ۔۔ اور ۔۔ غسل خانہ تو جیتا جاگتا ستیاناس کیا
جانے لگا ۔۔ کہ خدا کی پناہ ۔۔

کپڑے دھونے کا صابن ۔۔ سجی ۔۔ سر ملنے والی مٹی ۔۔ اور
نہ جانے کہاں کہاں کے بال ۔۔ نہ جانے کس کس قسم کی بدبودار دوائیں
۔۔ اور خاک بلا سبھی کچھ غسل خانے میں جمع ہونے لگا ۔ خدا جانے غسل بھی کس
کس طرح سے کئے جاتے تھے ۔۔ فرش کے علاوہ غسل خانے کی تمام دیواریں
۔۔ بلکہ چھت تک پانی کی چھینٹیں اڑ اڑ کے پہنچ جاتیں ۔۔ مگر یہ سب کچھ اس
وقت ہوتا ۔ جب میں کالج میں اپنی قسمت کو رو رہا ہوتا ۔۔
دماغ پکتے پکتے پھوڑا بن چکا تھا ۔ نہ کچھ میری سمجھ میں نہ آتا کیا کروں ۔
اس قسم کی باتوں کی روک تھام ہو سکے ۔۔ نہ یہ کہ قفل لگا کر پانی بند کرنا ۔

میں چاہتا نہ تھا ــــ لڑائی کی وجہ سے اوّل تو مکان مہنگے بھی بہت تھے ـ دوسرے ملتے ہی نہ تھے ــــ پھر ایسے موقع کے مکان! بازار بھی قریب! ہوٹل بھی نزدیک! اور پھر کالج بھی دُور نہیں ــــ عجب مخمصہ میں جان تھی ـ

اِدھر نیچے کی کرایہ دار عورتیں تھیں کہ میرے ساتھ بہت ہی "سوشل" ہو جانے پر تُلی ہوئی ــــ

"لڑائی میں کیا ہوا نہ جانے"

"تمھارا مکان کہاں ہے بابو ــــ جی"

"ذرا بابو ــــ یہ خط ــــ پڑھ دینا"

"جانے یہ مہنگائی کب ختم ہوگی"

"بیاہ نہیں ہوا ــــ ابھی تمھارا"

"بیچارے بڑے ہی اچھے ہیں بابو"

"ایک دوّنی کے پیسے تو نہ ہوں گے ــ تمھارے پاس"

"وکیلت (وکالت) پڑھ رہو ــــ آپ نا ــــ؟"

"ایک چٹھی لکھ دو ــــ ننھی کا ابّا ــــ لام پر چلا گیا ہے"

"ذرا ماچس دے دو"

میں سخت عاجز تھا کہ یا اللہ یہاں ہیضہ بھی نہیں چلتا ـ کمبخت ملیریا اور ٹائیفائڈ بھی ڈرتا ہے ان لوگوں سے ــــ نجانے گردن توڑ بخار ــــ اور پلیگ آج کل کہاں مر گئے ہیں ــــ دنیا کے تمام ڈاکٹر جھوٹے ہیں ــــ جو کہتے ہیں کہ گندگی اور غلاظت سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ــــ بالکل غلط یہاں تو دنیا بھر کی بیماریاں

خود سسکیاں لیکر ختم ہو جاتی ہیں — اور یہ سب مرکیوں نہیں جاتیں جو پیچھا چھوٹ
جاتا میرا — اللہ کرے زلزلہ ہی آجائے کہیں کوئٹہ کی طرح — اور یہ مکان —
— یہ تمام کوٹھڑیاں — سب کچھ ڈھیر ہو جائیں —

ایک طرف تو میں ان سب کے مرجانے کی دعا مانگ رہا تھا دوسری جانب
انہیں میں ایک نہایت مکروہ صورت بڑھیا — روزانہ کالج جاتے وقت اور واپسی
پر طرح طرح سے آنکھیں چمکا کر — بری طرح کولھے مٹکا کر — عجیب عجیب قسم
کے اشارے کر کے مجھ پر عاشق ہو جانے کی کوشش کر رہی تھی — روزانہ
میرے زینے سے اترتے ہی — پٹی میلی کچیلی ساڑی — سینے بالکل ہموار سینے
سے ڈھلکا کر — انگڑائیاں لیتی — بڑے زور زور سے کھانستی — کھنکھارتی
— ٹھنڈی سانسیں بھرتی — اپنی بے ہنگم اور بھدی پنڈلیوں کو کھول کر
— اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگتی — مسکراتی — !

"کیا سکول جا رہے ہو — بابو —" ؟

"ایک آنہ پیسہ ہو تو دیدو —" !

"نجانے — کیوں — مریں — درد ہو رہا ہے آج"

"کل آؤ رات — نا —" ؟

مجھے اس کی ان فضول اور بیہودہ حرکتوں پر رہ رہ کر بہت ہی غصہ آتا —
اور میں بھلا کوئی جواب دیئے ہوئے نفرت سے منہ پھیر لیتا — !

پانی بند کر دینے اور قفل لگا دینے کا مسئلہ ابھی تک زیر غور ہی تھا — کہ ایک

کالج سے مجھے دوپہر کو ہی واپس آنا پڑا ـــــ شاید اسٹرائیک ہو رہی تھی ـــ میں
جو گھر پہنچا ہوں تو میرا غسلخانہ پانی کے نل کی بے پناہ آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میرے
غصے کی انتہا نہ رہی ـــ میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اپنے ہی غسلخانہ میں سہی مجھے اس
طرح بیدردانہ چلے جلنے کا کیا حق حاصل تھا۔
بس سچ مچ میں سکتے میں رہ گیا ـــ"
ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اپنے دونوں پاؤں جوڑ کر اکڑوں بیٹھ گئی
اس کے سارے بدن پر کپڑے کا ایک تار بھی نہ تھا ـــــ بکھرے ہوئے گھنیرے
بالوں سے پانی اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے زور زور سے مینہ برس رہا ہو ـــ
"بابو ـــ اب کبھی نہ آؤں گی ـــ نہانے کیلئے ـ"
اس نے آنکھیں جھکائے ہوئے کہا!
آج پہلی مرتبہ ایسا معلوم ہوا جیسے کثافتوں میں نور جگمگا اٹھا!
بالکل کمسن! گورے چٹے رنگ کی دبلی پتلی لڑکی ـــ
کیا ایسے گندے اور کثیف ماحول میں یہ خوبصورتی بھی ہو سکتی ہے!
میرا دل دھڑکنے لگا ـ"
"مگر ـــ مگر ـــ تو ـــ! میں نے پوچھا ـ"
"میں ـــ رانی ـــ ہوں! پرشادی بھیا کی بہن ـــ وہ بولی ـ!
"رانی" میں نے سوچا وہ سچ مچ "رانی" ہی تھی ـــ میں جلدی
سے غسل خانے سے باہر نکل آیا ـــ
"تو نہائے ـــ خوب! میں خفا نہ ہوں گا ـ"

نجانے کیسے طرح اتنا سیدھا پانی بہا کر جلدی سے وہ باہر نکل آئی —
اس کا چہرہ شرم و ندامت سے عرق عرق ہو رہا تھا — اور سینہ زور زور سے
اُچھل رہا تھا —!

"تو روز نہا — جایا کر — آکر" میں نے خود اسے دعوت دی۔
"نا — بابو — اب کبھی ایسی خطا نہ ہوگی!" وہ کہنے لگی۔
"نہیں — نہیں — میں خفا نہیں ہوں — رانی!"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی جلدی وہ زینے سے نیچے
اُتر گئی —!

آج اتنے دنوں میں پہلی بار میرا دل کثافتوں کی طرف کھنچتا ہوا محسوس ہوا
گندگی کی بدبودار سنڈاس کی کوٹھری میں مجھے ایک بے پناہ جنت نقشاں نظر آنے
لگی — میرے سارے کوٹھے کی جگمگاہٹ اور رونق آج سمٹ کر اسی گندے
غسل خانے میں سما گئی تھی — جہاں کی بدبودار ہوا میں ہوش و حواس کو پراگندہ کر دینے
میں اب تک اپنی مثال آپ تھیں — اور — آج — وہ — مگر
میرا دل چاہتا تھا کہ کوٹھے کی تمام کرایہ دار عورتیں — وہی گندی میلی کچیلی عورتیں —
نہایت غلیظ اور کثیف عورتیں، سب میرے کوٹھے پر برتن مانجھنے آجاتیں —
اپنی میلی میلی ساڑیاں اور لہنگے پھیلا دیتیں، انہیں دھو دیتیں — اور اتنا پانی
بہاتیں کہ میرا کوٹھا سیلاب میں بہہ جاتا — وہ سب بہت بن بن کے ٹھگتیں اور
بے تکی و بے ہودہ باتیں کرتیں — میرا ضمیر آج اتنا ستیاناس کیا جا —
ورانے سے تھا۔ رانی ابھی ہوتی —!

ہفتہ بھر میں کئی مرتبہ میں وقت بدل بدل کر کالج سے ناوقت واپس آ گیا لیکن ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے غسلخانے کا آہنی نل زور زور سے پانی بہا رہا ہو۔ کئی بار میں غسل خانے کے اندر تک چلا گیا لیکن وہاں کوئی نہ تھا! مجھے نیچے بھی رانی نظر نہ آئی — ! جانے کہاں رہتی ہے وہ — ؟ یہ پرشادی کون ہے؟ کیا کرتا ہے — ؟ کس نمبر کی کوٹھڑی میں رہتا ہے — ! مجھے آج تک معلوم نہ تھا — اتنے دنوں میں کبھی میں نے ان لوگوں کی بابت کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھا — اب کیسے پوچھوں۔ اس سے — اور کیا پوچھوں — ؟

اتوار کے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا — دل کی دھڑکنوں کا شمار کر رہا تھا کہ پوسٹ کارڈ ہاتھ میں لئے ہوئے وہ آ گئی — گہرے رنگ کی سیاہ ساری سے اس کا بلوریں جسم بالکل اس طرح چمک رہا تھا۔ جیسے کالے کالے بادلوں میں سے جھانک رہا ہو —

میں بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا —

"را — نی"

"بابو — ذرا یہ خط پڑھ دو —" اس نے پوسٹ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔!

"کہاں سے آیا" نہایت گھبرایا ہوا لغو سوال میں نے کیا۔

"جانے کہاں سے" آنکھیں گھماتی ہوئی بولی — "شاید جیجا نے بنارس سے بھیجا ہوگا —!"

میں نے اپنے سوال کی مہملیت پر شرمندہ ہو کر سارا خط زور زور سے

پڑھ کر سُناتے ہوئے پوچھا ــــ:
• جواب لکھ دوں ــــ رانی • ــــ اب تم نہانے نہیں آتیں ــــ
کیا بات ہے ــــ؟
• بات تو کچھ نہیں ــــ وہ برابر نگاہیں نیچے کئے رہی ــــ ماتا جی!
بیمار ہیں ــــ:
• کہاں ــــ کیسے ــــ کب ــــ میں سب کچھ جلدی جلدی
پوچھ لینا چاہتا تھا ــــ:
• بخار ہو گیا تھا ــــ اب کھانسی بھی آنے لگی • وہ بولی
• دوا نہیں پلائی • میں نے ہمدردی سے پوچھا
• ہاں دوائی اسپتال سے رکھی تھی ــــ پر ــــ فائدہ نہ ہوا ــــ اس
نے جواب دیا • اچھا اب جاتی ہوں ــــ:
اس نے چلنے کیلئے قدم اٹھایا ہی تھا میں نے پوچھا ــــ
• جواب ــــ جواب نہیں لکھواؤ گی ــــ؟
• ماتا جی سے پوچھ آؤں •
• اس کے قدم بڑھتے ہی رہے •
• مجھے انتظار کرتے تھوڑی ہی دیر لگی تھی کہ وہ لوٹ آئی ــــ
• ماتا جی کہتی ہیں ــــ لکھ دو بابو ــــ بڑی دیا ہوگی ــــ •
اس کی نگاہوں سے التجائیں برسنے لگیں ــــ
• دیا ہوگی ــــ کیسی دیا ــــ بیٹھ جا ــــ رانی ــــ میں نے پیچھے سے

کہا ۔ میرے دل کی رانی ــــ!

نہیں ــــ بابو ــــ میں مزے ــــ میں ..... !

میں نے زبردستی شانے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا ــ

"رانی"

چٹھی ــــ لکھ دو ــ بابو۔ اس نے کہنا شروع کیا ۔لکھ دو ۔ ماتا جی کو بخار ہے ــــ اور پرشادی بھیّا کی نوکری بڑھ گئی ہے! ــــ اور ــــ اور ــــ پرنام ــــ اور ــــ اپنی خبر لکھو ــ سُندری کا کیا حال ہے ــ اور ــــ سب راضی خوشی ــــ سب کو رام رام ــــ متھرا کی ماں ــــ جاڑے بخار میں مر گئی ــــ اور سب کو رام رام ــــ سب راضی خوشی ــ

وہ یکایک کہتے کہتے رُک گئی ــــ

پر ــــ خط تو ہے نہیں ــــ ڈاک خانہ بھی بند ہوگا ــــ

میں نے کہا۔

گھبراتی ــ کیوں ہے ــ سب ہو جائے گا!

میں نے جلدی جلدی میز کی دراز سے پوسٹ کارڈ نکال کر لکھنا شروع کر دیا ــــ!

اور کیا لکھ دوں ــــ؟

اور ــــ اور ــــ جو جی میں آئے لکھ دو!

اپنی ساری کے پلّوسے کھیلتی ہوئی وہ بولی۔

مجھے تو اس کی سادگی پر ہنسی آگئی ۔ وہ بھی جھینپ کر مسکرا اٹھی۔

میں نے دو چار رسمی باتیں بڑھا کر پوسٹ کا سادہ حصّہ بھی سیاہ کر دیا۔

۔لکھوائی ۔۔۔۔ دو ۔۔۔ رانی:

لکھوائی۔ ۔۔۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی!

۔ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ لکھوائی ۔۔۔ یہ خط جو لکھا ہے میں نے اس کی لکھوائی مانگ رہا ہوں؛ میں نے کہا:

۔مگر ۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی ۔۔۔ میرے پاس کچھ نہیں بابو ۔۔۔!

میں نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ ۔لیکن لکھوائی تو دینا ہی ہوگی۔

۔ ماتا جی دیں گی! وہ بولی کتنے پیسے ہوئے۔

اس کے چہرے کا، ضطراب و پریشانی پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اگر اسے پہلے معلوم ہوتا کہ لکھوائی کے پیسے بھی دینا پڑیں گے تو وہ خط نہ لکھواتی ۔

اس کی پُر اضطراب سادگی مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اس کے بھولے پن اور سادگی پہ میرا دل بیقرار ہو گیا ۔۔۔ میرا دھڑکتا ہوا دل اس کے اُبھرے ہوئے سینے کے مدوجزر میں ہچکولے لینے کیلئے بڑھتا چلا گیا ۔۔۔ اور ۔۔۔ میرے لب اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کے قریب پہنچ گئے ۔۔۔

۔رانی۔

دروازہ کی آڑ سے سامنے آکر وہ پکاری۔

وہی بدشکل بڑھیا ۔۔۔ جو مجھ پہ ریجھی ہوئی تھی ۔۔۔ بجلی کی طرح کوند

کر رانی کمرہ سے باہر اور زینے پر! میں سکتے میں جہاں کا تہاں کھڑا — رہ گیا بڑھیا کا یہ المنظر بڑھیا — اب وہیں کھڑی تھی جہاں پر رانی میرے دل کی رانی تھی! بڑھیا کے پچکے ہوئے گال — ریس کورس کے میدان جیسا چٹیل سینہ میرے دھڑکتے ہوئے دل کے مدّو جزر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ بدرونق — اور — دھنسی ہوئی آنکھیں — چمک رہی تھیں اس کی — وہ مسکرا رہی تھی!

"بابو میں — کسی سے کہوں گی — نہیں"

"دیگر احوال یہ ہے"

ابھی شاہجہان پور پہنچے ہوئے مجھے ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ نہایت
ہی معتبر ذرایع سے معلوم ہوا کہ اس دارِ فانی میں میرے ایک بالکل قریبی نہیں —
بلکہ یوں سمجھ لیجئے حقیقی رشتہ دار موجود ہیں — یعنی کہ میری جنت آرام گاہ بیوی
کے سگے . نانازاد . — خالو ابا — میں ابھی علم الانساب . کی اس بھلک
گتھی میں اُلجھا ہوا سوچ رہا تھا کہ الٰہی ان بیوی زاد "رشتہ داروں کی قطعی اور
حتمی کتنی قسمیں ہوتی ہیں — . . . . اور آیا جراثیم وو ٹامن کی طرح ان کی تقسیم بھی
اے . بی . سی . زیڈ . تک کی جاسکتی ہے — یا نہیں کہ ناگہاں میاں خیر اللہ
میرے آقائے نامدار نے آکر اطلاع دی — :

ایک صاحب — صاحب — آپ سے ملنا چاہتے
ہیں — مولوی عبدالمنان صاحب — :

میں نے سوچا — ایک صاحب — اور وہ — بھی —
مولوی — پھر عبدالمنان — خداوندیہ ماجرا کیا ہے حقیقتاً میں ان —
مولویوں سے ایسا ہی لرزتا ہوں جیسے قصائی سے وہ بڑا جانور — جس
پر اکثر بقر عید کے دن ہندوستان میں نہایت فراخدلی کے ساتھ کشت و خون

ہو جایا کرتا ہے ــــ!

مولوی ــــ وہ چاہے کسی درجہ کا کیوں نہ ہو ــــ بہرحال مولوی پھر مولوی ہی ہوتا ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ ذرا ہز ہولی نس قسم کے مولوی زیادہ دلفریب و جاذب نظر ہوتے ہیں ــــ اور کم از کم براہِ راست اللہ میاں کو "رنگ" کر لیتے ہیں ــــ ان کے قبضے میں جو جنتیں ہوتی ہیں وہ اعلیٰ قسم کی ــــ جیسے ہندوستانی ریلوں کے فرسٹ کلاس "ڈیپارٹمنٹ" یعنی جتنا گڑ ڈالئے اتنا ہی میٹھا ہوگا ــــ اس لئے چھوٹے درجہ کے مولوی ــــ ذرا چھوٹے درجہ کی جنت "دے سکتے ہیں ــــ بہرحال میں یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ــــ کانپتے ہیں "سلام علیک" کی آواز گونج اٹھی ــــ!

میں نے "وعلیکم السلام" کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے عرض کیا ــــ!

تشریف رکھیئے ــــ کیسے زحمت فرمائی جناب نے ــــ!

کمرے کو چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے ــــ!

جی ــــ جی ــــ مجھے صدیقی صاحب سے ملنا ہے ــــ!

میں نے ادب سے کہا ــــ

میں ــــ حاضر ہوں ــــ فرمایئے ــــ؟

آہا ــــ ہا ــــ حیرت سے صوفوں کے گدوں میں دھنستے ہوئے بولے ــــ آپ ہی ہیں ــــ جی بہت خوب ــــ آپ نے مجھے پہچانا نہیں ــــ "خوب ــــ"

جلدی سے لپک کر میرے ہاتھوں میں پنجہ لڑانے کے انداز سے چمٹ
پڑے ۔۔۔!
کمال کیا ۔۔۔ تم نے ۔۔۔ ارے بھئی تم تو میرے بہت ہی قریبی عزیز
ہو ۔ میرے گھر میں خدا بخشے تمہاری پہلی بیوی کی خالہ ہوتی ہیں ۔۔۔ بس یوں سمجھو کہ
تمہاری ۔ ننیا ساس ۔ اور میری خوشدامن صاحبہ مرحومہ ۔ خدا مغفرت کرے ۔۔۔
ان سب کے آباؤ اجداد خلد آشیاں غازی سلطان محمود غزنوی کفر شکن
رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے حملہ میں عرب سے ایک ساتھ آئے تھے ۔۔۔ اور ان سب
میں بہت ہی میل و محبت ۔۔۔ اخلاص و یکجہتی ۔ آپس داری و مروت تھی ۔
پھر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ کیا لوگ تھے ۔۔۔ کیا زمانہ تھا ۔۔۔ اب
دیکھیئے ۔۔۔ ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں ۔۔۔ نگلے جاتا ہے ۔۔۔
بس ۔۔۔ کفر ۔۔۔ الحاد ۔۔۔ بے دینی ۔۔۔ شرک ۔۔۔ بے مروتی ۔۔۔
بدخلقی ۔۔۔ میں تم سے کیا کہوں ۔۔۔ دنیا کا کیا حال ہوتا چلا
جا رہا ہے ۔۔۔!!

مولوی صاحب سلسلہ وظیفہ کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ جاری
رکھنا چاہتے تھے ۔۔۔ مگر میری طبیعت الجھ رہی تھی ۔ میں نے دخل
در معقولات کرتے ہوئے کہا ۔۔۔
بڑی خوشی ہوئی جناب سے مل کر ۔۔۔ دولت خانہ
کہاں ہے نا ۔۔۔؟
یہی تو کہہ رہا تھا میں ۔۔۔ پھر ارشاد ہوئے تھے ۔ میاں برادران

یوسف کی چیرہ دستیوں نے مجھے بے گھر کر دیا ___ اب کوئی پندرہ سال سے تو یہیں ہوں ___ مگر تمہاری خالہ جان البتہ وہیں مراد آباد میں ہیں اور نور چشمی فہمیدہ سلمہا بھی ___ بڑی اچھی لڑکی ہے ___ اب میں کیا بیان کر دوں تم سے ___!

کلام پاک ___ اردو فارسی ___ سب کا تکملہ کر چکی ہے ___!

زمانے کی حالت دیکھتے ہوئے ___ میں کہتا ہوں تم سے کیا پردہ ___ لڑکیوں کے انگریزی سکول میں بھرتی کرا دیا ہے ___ حالانکہ سچ پوچھو تو میں لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے سخت خلاف ہوں ___ مگر صرف ان کا خیال ہے وہ کہتی ہیں ___ اور ٹھیک کہتی ہیں ___ بڑھاپے کی اولاد سے محبت ہی زیادہ ہوتی ہے ___ پھر جو اولاد بارہ بچوں میں زندہ بچے اس کی محبت کہاں تک نہ ہوگی ___ ہاں تو کہہ یہ رہا تھا کہ مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا سبب یہ فرنگیوں کا تمدن ہے ___ مجھے تو قطعی نفرت ہے اس تعلیم سے ___!

قطع کلام ۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا ___!

اور جناب کیا شغل فرماتے ہیں یہاں ___

میں ___ مولوی صاحب نے کہا ___ میں یہاں شاہی مسجد میں ۔ امام جمعہ والجماعت ہوں ___

مختصر یہ کہ مولوی صاحب کافی دیر تک میرا دماغ چاٹتے رہے ___ اسلام کا عروج و زوال ___ مسلمانوں کی بدحالی ___ روزہ نماز ___ چندہ اور

دوزخ — جنگ — تعلیم نسواں — آزادی — شاعری — شاہجہانپور کی مسجدیں — غرضکہ دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر کچھ نہ کچھ سمع خراشی نہ کی گئی ہو —! پھر لطف یہ کہ چلتے وقت آئندہ آنے کے لئے وہ انشاءاللہ کہہ گئے —!

دوسرے دن حسب وعدہ مولوی صاحب پھر تشریف لائے —! کچھ نیے وہ شدت و بسط کے ساتھ موعظ حسنہ بیان فرمانے کی بجائے مختصر انداز میں کنائت شعاری پر تبصرے ڈالا — مسلمانوں کو لہو و لعب اور فضول خرچیاں چھوڑ دینا چاہئیے — درکفائت شعاری سے کام لینا چاہئیے — قیامت کے دن قریب ہیں وغیرہ وغیرہ —! چلتے چلاتے بادامی کاغذ کی ایک پڑیہ بڑھاتے ہوئے کہنے لگے — یہ خط اپنی خالہ جان کو دے دینا —

ہوا یہ تھا کہ پہلے دن اثنائے گفتگو میں میں نے عنقریب اپنے مراد آباد جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا — چنانچہ یہ بادامی کاغذ کی پڑیہ دراصل ایک دستی خط تھا جو مولوی صاحب نے اپنی بیوی کی بہنی میری خوشدامن کی خدمت اقدس میں ارسال فرمایا تھا — جس کے "ادھری" کونے پر نہایت چمکیلی سیاہ روشنائی سے "بعونہ" اور "دکھنی" کونہ پر "دستی" تحریر تھا —

خود ساختہ لفافے کی تمام چولیں نہایت حفاظت سے چپکا دی گئی

تھیں ـــ کہ کہیں میں ان کا یہ محبت نامہ کھول کر نہ پڑھ لوں ـــ!

ظاہر ہے کہ اتنے چھوٹے سے کام کیلئے ایسے نزدیکی رشتہ دار سے انکار کرنا نہ محض بداخلاقی تھی ـــ بلکہ اپنی مرحوم بیوی کی روح کو ایک طرح سے تکلیف دینا تھا ـــ

مرادآباد پہونچتے ہی میں نے یہ خط مولوان صاحبہ کی خدمت میں بھیجدیا ـــ لیکن نوکر نے واپس آکر یہ سنائی کہ مولوان صاحبہ نے پوچھا ہے کہ آپ کب شاہجہان پور واپس جائیں گے ـــ جس کے کھلے ہوئے معنی یہ تھے کہ کم ازکم مولوان صاحبہ کا محبت نامہ بھی لیجانا ضروری ہوگیا! تیسرے دن شاہجہان پور واپسی کے وقت ایک چھوٹی سی پوٹلی میں کتری ہوئی چھالیا۔ چکنی ڈلی وغیرہ مع ایک خط کے پہونچ گئیں ـــ!

شاہجہان پور پہونچکر یہ سامان اور خط میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں بھیجدیا ـــ چنانچہ سامان پہونچتے ہی مولوی صاحب سراپا شکریہ خود تشریف لے آئے ـــ اور دیر تک مرادآباد کے چشم دید حالات نہائت اشتیاق و انہماک سے پوچھتے رہے ـــ!

منشی نیازالدین صاحب تو اچھے ہیں ـــ؟

اور مولوی کرم علی صاحب کی بیوی ـــ چہ ـــ چہ ـــ چہ ـــ کیا خوب آدمی تھے ـــ!!

اب اس بڑی مسجد میں نماز کون پڑھاتا ہے۔ آجکل ـــ

تو آپ خود گئے تھے اپنی خالہ جان کے پاس ـــ؟

لاحول ولاقوۃ ــــ ارے بھئی تم سے کون پوچھ ــــ چہ خوش:

اب کب تک قصد ہے انشاءاللہ ــــ!

ظاہر ہے کہ اس قسم کے لغو سوالات کا میں کہاں تک جواب دے سکتا تھا ــــ مولوی صاحب تھے، بہشتی ــ نائی ــ اور نہ جانے کہاں تک کی خیریت معلوم کرنے کیلئے بے تاب ــ! بڑی مشکل سے رخصت ہوئے ــ

اب باقاعدہ یہ ہونے لگا تھا کہ مولوی صاحب میرے مرادآباد جانے کے پروگرام سے باخبر رہنے لگے ــــ اور ہر مرتبہ کم ازکم ایک دستی خط ــــ اور میلے کپڑوں کی گٹھری وغیرہ سیکر اسٹیشن پہونچ جاتے ــــ مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے یہ سامان میرے سامان کے پاس احتیاط سے رکھدیا جاتا ــــ اور بس ــــ!!

مرادآباد سے واپسی پر مجھے اس سامان کے تبادلے میں کتری ہوئی چھالیہ، پکا ہوا کتھا، دھلے ہوئے کپڑے ــــ ایک آدھ حلوہ حتی کہ لگے ہوئے پانوں کی ڈبیا تک اکثر لانا پڑتی ــــ اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک اچھی خاصی دخانی کشتی بن گیا تھا ــــ جو ساورستے نام پیدا وار لاد کر دوسرے ملکوں میں لیجا کر واپس ــ درآمد میں ایسی چیزیں لاتا تھا جن کا دستیاب ہونا اپنے دیس میں ممکن نہ تھا ــــ!

حسب دستور قدیم ایک مرتبہ جو مولوی صاحب مجھے خدا حافظ کہنے کیلئے تو پورے تین بکس کپڑوں کے ــــ اور ایک خوان کھانے کا۔

ایک بورے میں تانبے کے برتن ___ اور صرف ایک دستی خط ساتھ تھا ___ گاڑی چھوٹنے میں وقت بہت کم تھا انہوں نے جلدی جلدی سب سامان بھر وادیا میرے درجہ میں ___ اور یہ عرض کرنے کا موقع ہی نہ دیا ___ کہ جناب اس لڑائی کے زمانہ میں تن تنہا سفر کرنا تو دشوار ہے، چہ جائیکہ اس کثرت سے سامان لاددیا جائے!

ٹرین روانہ ہونے سے پہلے ہی مولوی صاحب نے خدا حافظ کہدیا تھا اور سارے درجہ میں بیٹھے ہوئے مسافر میری جان کھائے جا رہے تھے ___

اجی ___ یہ سامان بریک میں رکھوائیے! یہاں جگہ نہیں ___!

رام ___ رام ___ اوپر نہ رکھئیے گا کھانا ___ گنگا جلی رکھی ہے وہاں ___!

واہ صاحب ___ بکس ہٹائیے کھڑکی کیسے کھلے گی ___

مسٹر ___! یہ مال گاڑی نہیں ہے ___ ڈیرہ ہے!

کہاں جانا ہے ___ آپ نے ___؟

مارے غصہ کے میرا خود بُرا حال تھا ___ جی چاہتا تھا کہ سارا سامان کھڑکی سے نیچے پھینک دوں ___ یا خود کھڑکی سے کُود کر خودکشی کرلوں ___!

کیسے کمینے ہوتے ہیں وہ لوگ ___ جن کو دوسروں کی تکلیف کا کوئی خیال نہیں ہوتا ___ خود غرضی تو دیکھئے پورے ویگن بھر سامان لاددیا ہے مجھ پر ___ یہ کفائت شعاری پر لیکچر جو دیئے جا رہے تھے اس روز ___ وہ اسی روز بد کیلئے تھے ___ تاکہ دوسروں کو زحمت میں ڈال کر اپنا کام نکالا جائے۔

یکایک برتنوں کے بورے کی رسی جو کھلی تو ایک تانبے کا لوٹا جھانکنے لگا
— جس پر موٹے موٹے لفظوں میں ۔ رشید احمد خان یوسف زئی ۔ لکھا ہوا
تھا — میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی — یہ شاہجہان پور کے ایک
بڑے رئیس تھے — جن کا انتقال ایک مہینہ پہلے ہو چکا تھا — یعنی:
جو کچھ سامان میں ملے جا رہا تھا خاں صاحب کے چالیسویں میں بطور رشوت
کے مولوی صاحب کو پیش کیا گیا تھا — تاکہ وہ مرنے والے کے لئے جنت
میں ایک اچھی سیٹ ۔ ریزرو کرادیں — کھانے کا یہ بستہ خان بھی انہیں کا
توشۂ آخرت تھا — اور ان صندوقوں میں انہیں کے کپڑے تھے — شاید —
گویا کہ — اس عالم میں اگر کوئی جاننے والا دیکھ لیتا مجھے تو یقین کرنے کی کوئی
وجہ ہی نہ تھی کہ آپ کا شمار بھی خدا سے ۔ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین ۔ میں
ہونے لگا ہے اس لڑائی کے زمانہ میں —!

کچھ غصہ — کچھ شرم — کچھ ذلت —! ایک عجیب حال تھا میرا —
کئی اسٹیشنوں تک میری سمجھ میں یہ آیا ہی نہیں کہ بدن پر یہ چیونٹیاں سی کیوں رینگ
رہی ہیں شیروانی کے نیچے تو کیوں —؟ لیکن جب ہاتھ سے کھجا کر دیکھتا ہوں
تو پیٹھ پر سے دھار سے قورمہ کی پیپ رس رہی ہے دھیرے دھیرے —!
شیروانی سے کالر سے لیکر پائجامے تک رشید احمد خان صاحب کے چالیسویں
کا قورمہ بہہ رہا تھا — میرے کھانسنے اور کسمسانے پر دو ایک مسافروں نے
تو کھڑکی سے منہ نکال کر رومال لگا لیا — پاس بیٹھے ہوئے دو تین مسافر
کچھ سرک گئے —!

زیادہ مار میں تو یہ بھول جاتی ہے ——— میرا یہی حال تھا اس وقت!
بدحواس اور پریشان ——— اے یا اللہ کیا کروں ——؟ جیسے کیسے خوان کھول کر پلیٹیں برابر کیں اور اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھ گیا ———

راستہ میں کئی مسافروں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ——— کہ آخر کھانا ساتھ لانے کی کیا وجہ تھی ——— مگر میں نے کسی قسم کا بیان دینے سے صاف انکار کر دیا

اب گاڑی مرادآباد کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے جیب سے مولوی صاحب کا دستی خط نکال کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھڑکی سے باہر اڑا دیئے!

اسٹیشن آ چکا تھا کئی قلیوں نے مل کر یہ سامان باہر نکالا ——— چیک ہوتے ہی کانٹے پر پہونچا دیا گیا ——— گیارہ روپیہ سوا تین دیگر میں جو پلیٹ فارم سے باہر آیا ہوں تو میرے پاس قلیوں کو دینے کے بھی دام نہ تھے ———

بیچارہ تانگے والا شریف تھا ——— اس نے یہ مشکل بھی آسان کی ———

گھر پہونچتے ہی پہلا کام جو کیا میں نے وہ یہ تھا کہ یہ تمام کھانا کپڑے اور برتن وغیرہ محتاجوں کو تقسیم کر دیئے ——— جو نہایت صمیم قلب سے میری مغفرت کے لئے دعائیں کر رہے تھے ———

بھوک ہڑتال!

اے ہے — دو گز لمبے کی اوقات ہی کیا تھی — میں نے کہا، کہتے کہتے زبان سوکھ گئی — مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں — دو دن میں بقر عید آئی جا رہی ہے — نگوڑا مجبوب ننگا پھریگا ننگا — ؟

جیسے ایک دم سے ہوائی حملہ کا بگل بج گیا ہو اس طرح بیگم بول رہی تھیں کروشیا اور اون میز پر پٹکتے ہوئے پھر سلسلۂ بیان جاری کر دیا —

اور آپ ہیں — کہ دن ہوئے یہ اخبار، رات اخبار — نہ گھر سے مطلب — نہ بچوں سے غرض، بس چوبیس گھنٹے ہے اور اخبار — میں کہتی ہوں نوج کسی کو اخباروں کا روگ لگ جائے —

بیگم — میں نے عینک کی کمانی کو سنبھالتے ہوئے کہا، نہیں ملتا تمہاری جان کی قسم — سارا امین آباد ڈھونڈ ڈالا — نخاس، دریبہ چھان ڈالا — مگر مینہ کا نام نہیں — تم تو جانتی ہو کہ لڑائی کے زمانہ میں —

ہاں! ہاں — میں خوب جانتی ہوں، بیگم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا — سارا ملبہ جرمن اور جاپان کے کلیجہ میں گھس گیا — آفت پڑے اس لڑائی

پر ـــ اچھا بہانہ مل گیا ہے ان سب کو! کوئی چیز کہو ـــ لڑائی کی وجہ سے نہیں ملتی ـــ جیسے ساری دنیا لڑائی پر چلی گئی ہے ـــ نوکر ہیں وہ نہیں ملتے ـــ مکان ہیں وہ نہیں ملتے ـــ مہینوں سے کہہ رہی ہوں کہ یہ مکان سردیوں میں رہنے کے قابل نہیں ـــ مگر آپ ہیں کہ ایک کان سنا اور دوسرے کان اڑا دیا ـــ

سنو گی بھی کسی دوسرے کی یا اپنی ہی کہتی چلی جاؤ گی! میں نے کہا میں کہتا ہوں ـــ

ہاں ـــ کیا کہتے ہیں آپ ـــ؟ بیگم بولیں ـــ

عرض کر رہا ہوں میں کہ ـ میں نے کہا ـ لڑائی کی وجہ سے تمام آدمی کارخانوں میں کام کرتے ہیں اسی سے ہر چیز کا توڑا ہے ـــ ملینہ تو اب مارکٹ میں ہے نہیں ـــ!

اور وہ جو نصیر میاں کی بیوی نے ابھی چار پانچ روز ہوئے منگوایا ہے وہ کہاں سے آگیا ـــ بیگم نے جواب دیا ـــ

اب یہ مجھے کیا معلوم! میں نے کہا ـ انہیں نصیر میاں کی بیگم سے پوچھو! کہیں بلیک مارکٹ سے خریدا ہوگا انہوں نے ـــ

تو پھر تم بھی وہیں سے لے آؤ ـــ بیگم بولیں ـــ

واہ بھئی واہ ـــ! یہ بھی تم نے اچھی کہی ـــ بیٹھے بٹھائے مجھے جیل خانے بھجواؤ گی ـــ میں نے جواب دیا ـــ!

جی ہاں ـــ! وہ کہنے لگیں ـــ اور نہیں تو کیا ـــ نصیر میاں بھی تو خدا نہ

کرے جیل خانے چلے گئے — یہ سب باتیں بس ایک نہ لانے کی باتیں ہیں

بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں —

بیٹھو — بیٹھو — تم خفا ہو گئیں! میں نے کہا — تم جانتی ہو کہ اگر تمہارے کام — !

بس بس، رہنے دیجئے لوچ پوچ کرنے کو! دیکھا جب — دو گز ملینہ تو آپ کے لائے نہ لیا گیا —

بڑبڑاتی ہوئی بیگم باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں —

میں بڑی دیر تک۔ تریا ہٹ۔ کی اسی الجھن میں پڑا رہا — لڑائی کی وجہ سے گرم کپڑا تو عنقا ہو گیا ہے — اور یہ عورتیں ہیں کہ بیٹھنے نہیں دیتیں — دوپٹوں کی ململ وہ غایب — کنٹرول والے ہیں کہ ساری دنیا کو ساڑیاں پہنا دینا چاہتے ہیں — یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان کی عورتیں ساریوں کے علاوہ ایک طرح کا اور بھی لباس پہنتی ہیں — جس میں ایک چیز دوپٹہ بھی ہوتا ہے —

سامنے پڑے ہوئے اخبارات کی سرخیاں نگاہوں کے نیچے ناچ رہی تھیں۔ مہاتما گاندھی نے مسٹر جناح کو مالش کرنے کی ہدایت کی۔ مسٹر چرچل کیوبک ست آ گئے — راجہ فارمولا ایک لعنت ہے ویسی کیسے —

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سرخیاں کھانے کھاتی تھیں — اگر مسٹر جناح نے گاندھی جی کے کہنے سے تیل مالش شروع کر دی تو کیا ہندوستان آزاد ہو جائیگا — اگر مسٹر چرچل کیوبک سے واپس آ گئے تو — اگر راجہ فارمولا —

بی نصیبن — اللہ رکھے — روز ہی دو ایک چینی کے برتن شہید کرتی ہیں
— لالٹین کی چمنی پھوڑ دی — شیشہ کا گلاس توڑ ڈالا — پوری
گھڑونچی الٹ دی — اس پر طرہ یہ — روزانہ دھمکیاں دیتی ہیں کہ میرا
حساب کر دیجئے —

دو گز ملیدہ کی تو خیر کوئی ایسی بات نہیں — جہاں سو وہاں سوا۔
سہی — مگر بیگم کی۔ تریا ہٹ۔ تو اب دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی
ہے — اور جب سے مہاتما گاندھی نے۔ بھوک ہڑتال۔ کا طریقہ نکالا
ہے — ایک نئی مصیبت پیدا ہو گئی ہے — جب خفا ہوئیں بھوک
ہڑتال — جب بگڑیں۔ مرن برت۔ آئے دن یہی سیاسی تحریکیں
میرے گھر میں زور پکڑتی جا رہی ہیں —!

کام میں کس کا جی لگتا تھا — سارا دن یہی سوچا کیا —!

قریشی صاحب سے پہلی کے وعدہ پر پچیس روپیہ قرض لئے — دفتر
سے اٹھ کر بزاز سے آیا — بڑی دوڑ دھوپ اور تلاش و جستجو کے
ایک جگہ گلابی رنگ کا ملیدہ ملا — خدا خدا کر کے ایک کاغذ میں جلدی جلدی
لپیٹ کر جیب میں رکھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے —

یکے تانگوں کی۔ ہٹو بچو۔ سے بچتے بچاتے جو گھر پہ پہونچے ہیں
تو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ۔ واردھا نگر ہے — ہم واردھا سے
بول رہے ہیں — یعنی کہ سارے گھر میں۔ مرن برت۔ اور بھوک
ہڑتال۔ تھی —!

بیچوں بیچ انگنائی میں کھٹولے پر بی نصیبن اپنے جھوٹے پھیلائے ہوئے کنگھی فرما رہی تھیں ـــ وہی ٹوٹی کنگھی جو اس وقت اُن کے ساتھ جہیز میں آئی تھی ـــ جب کہ ـــ بابل مورا نیہر چھوٹا جائے ـــ!

محبوب اور مرغوب اندر والے کمرہ میں تخت پر چپ چاپ پڑے تھے ـــ اور دالان میں بیگم منہ پھلائے میری قسمت کا رونا رو رہی تھیں ـــ!

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک ہلڑ سا مچ جاتا تھا ـــ مگر آج تو بی نصیبن تک اس قدر محوِ آرائش تھیں کہ ان کو میرے گھر میں آنے تک کی خبر بھی نہ ہوئی ـــ میں روزانہ دفتر سے آکر ناشتہ کرنیکا عادی تھا مگر آج ـــ باورچی خانہ میں ایسا سناٹا تھا جیسے آج ہی اس گھر میں کوئی غمی ہو گئی ہے ـــ!

بیگم کے پاس جو پہنچا تو وہاں کا رنگ ہی دوسرا تھا ـــ میں نے پوچھا ـــ کیسی ہو ـ مگر کوئی جواب نہ ملا ـــ ناشتہ کو پوچھا اس کا بھی کوئی جواب نہیں ـــ آج کھانا کیوں نہیں پکا ـــ اس کا بھی جواب نہیں ـــ! گویا کہ ایک چپ میں سو بلائیں ٹل رہی تھیں ـــ بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ آخر معاملہ کیا ہے ـــ؟ یکایک خیال آیا کہ یہ ـ ہے ـ "دوگز ململ"

جوں ہی جیب سے ململ نکال کر دیا ـــ کھلکھلا کر ہنس پڑیں ـــ!

"ململ لاتے ہو تو جانتی ـــ ارے نصیبن میاں کا ناشتہ لگاؤ ـــ"

سوچ لیا کہ میں تو کسی نہ کسی طرح کما ہی کھاؤں گا لیکن ان ٹھاکر صاحب کی زمینداری بکوا کر دم لوں گا ــــ ہم لاکھ پاسی سہی مگر اب ایسا بھی نہیں کہ وہ چھتری ہو کر دوسروں کی عزت بگاڑتے پھریں ــــ!

آبرو کا معاملہ ہوتا ہی ایسا ہے ــــ پاسی ہوئے تو کیا ــــ کبھی ہمارے پرکھے بھی یہاں راج پاٹ کر چکے ہیں ــــ یہ ان ریت تو ان اونچی ذات والوں نے ہمکو مٹانے کیلئے شروع کی ہے ــــ

بکرما نے تاریخ کی روشنی میں "رج پاسیوں" کی خاندانی عظمت کو دہراتے ہوئے کہا ــــ!

کلجگ کی مایا ہے ــــ غریب کی آبرو ــ بھگوان جانے ان بڑے آدمیوں کی نگاہوں میں کیا رہ گئی ہے اب ــــ نہیں تو پرانے زمانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا ــ اچھا ــــ

رمیشور کہنے لگا ــــ

ہاں بھیا ــــ غریب کی آبرو ــــ! بکرما کہتے کہتے رک گیا اور بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا ــــ!

"رمیشور"! مجھے اس وقت بس یہی "چنتا" ہے کہ "ہلسیا" کے کام سے فرصت مل جائے ــــ!

میں نے تو کہدیا جیسا ــــ چند دن ایک ہزار مانگتا ہے ــــ اور یہ بھی سمجھ لو ایسا لڑکا دس بیس کوس میں نہ ملیگا ــ کھیتی باڑی کا سارا کام خود کرتا ہے اور پڑھنا بھی ہے! ہلسیا سدا سکھ چین سے رہے گی ــ

بیگا، کو بکڑوا بلائیں گے ؟ میرا باپ تو کورٹ کی "پٹی" میں بستا ہے اور کورٹ بھی یہاں زمین جوتے ہے۔ ! وہ ہمیشہ ان لوگوں سے کترا جاتی تھی۔

آج بکرما کی "پیر" تھی اور پاسیوں کے "گڑور" پر اچھا خاصا جمگھٹا لگا ہوا تھا کیونکہ آج ساری رات کی "پیر" میں ہلسیا کا ہونا ایسا ہی ضروری تھا جیسے بکرما کا ۔۔۔ دکھیں لگانا ۔ جھونکنا ۔ رس چھنوانا اور "پنگ" جمانا ۔ یہ سب کام ہلسیا ہی کو کرنا پڑتے تھے ۔۔۔ بکرما تو گڑور میں لیٹا لیٹا حقہ پی پی کر صرف کھانسا کرتا تھا ۔ یا کبھی کبھی اونگھائی سے چونک کر کہتا۔

"ہلاسیا ۔۔۔ تنی چلم بھر دے۔"

سورج نکلتے نکلتے ہلسیا اور اس کا چھوٹا بھائی "جگا" چھ چھ پسیری کی دو بھیلیاں جما کر رکھ دیتے اور بکرما نگاہوں ہی نگاہوں میں یہ اندازہ لگایا کرتا کہ اگر یہ گڑ کی بھیلیاں بہیں "چکتے" میں بک جائیں تو گاڑی کا کرایہ ۔۔۔ چونگی کا محصول اور کشوتی کے جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائیگا ۔ نہیں تو انتظار کرنا پڑے گا کہ جب یہ "تیرپان" پورا ہو جائے تو شہر لیکر جائیں ۔۔۔ مگر آج کل بھاؤ تو گھڑی گھڑی چڑھتا اترتا ہے ۔۔۔ ابھی پرسوں سوا چار سیر کا بھاؤ تھا۔ کل ہی معلوم ہوا کہ ساڑھے چار سیر کا ہو گیا ۔۔۔

بکرما کی نگاہیں آج "گڑھاؤ" کے ایک ایک گھان میں ہلسیا کا بیاہ رچا ہوا دیکھ رہی تھیں وہ سوچ رہا تھا کہ اگر چار بیگہ ایکھ میں سب خرچہ نکالکر پانچ سو بھی بچ گئے تو پانچ سو کہیں اور سے بندوبست کر کے اس سال ضرور ہلسیا کا بیاہ نپٹا دوں گا ۔۔۔ بڑا سی جوان لڑکی ۔۔۔ گاؤں کا ناک الگ

ـ ادوسری ـ میں تم پر لیتا ـ مجھے یہ ـ تیر ہان ـ پورا کر لینے دو ـــ شنکر اہیر ذرا سخت مزاج آدمی تھا مگر بکرما کی لجاجت بھری التجا وہ بھی نہ ٹھکرا سکا ـ!

کل کی بیر میں ستروہن کی پارٹی آدھی رات تک بھٹی ہوئی تاپتی رہی مگر ـ ہلتیا ـ نے کسی کو موقع ہی نہ دیا ـ اسی سے گھبرا کر باری باری سب لوگ ٹھٹھرتے جاڑے میں اپنے گھروں کی طرف چلے گئے ـــ! لیکن آج ستروہن نے یہ سونچا کہ شائد اس بھیڑ میں زندگی بھر ہلتیا سے بات ہی نہ ہو سکے ـ

اس لئے آج دس بجے کے بعد جب آگ تاپتے تاپتے بہت سے نوجوان مایوس ہو کر جا چکے تھے وہ ـ گڑور ـ پر پہونچا ـــ بکرما ـ گڑور ـ کے اندر رضائی اوڑھے ہوئے چپ چاپ لیٹا تھا ـــ اور ہلتیا گڑھا کے سامنے بیٹھی ہوئی جھونکتا جھونک رہی تھی جس کی تیز تیز لپٹیں بھٹی کے اندر سے نکل کر دور دور تک روشنی پھیلا رہی تھیں ـــ!

ستروہن چپ چاپ جا کر آگ کے پاس بیٹھ گیا ـ جگا ـ اونگھا اونگھا کر کولھو میں ادکھیں لگا رہا تھا ـــ اور بڈھا کنور منہ سے دھوتی اوڑھے ہوئے بیل ہانک رہا تھا ـ!

کیا بکرما کاکا سو گئے ـــ؟

ستروہن نے ہلتیا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ـ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا ـــ

کتنی دیر ہے اس پاگ میں ـــ

ستروہن نے دوسری طرح پر سلسلہ کلام شروع کرنے کی کوشش کی

کس نے چھو دی ہوں ـــــ وہ چونک سی پڑی ـــــ بدن خود بخود سُکڑ گیا ـــــ یہ تو کسی کے ہاتھ تھے ـــــ!

ستروہن دادا ـــــ!

وہ اٹھ بیٹھی ـــــ لیکن اس کی نگاہوں سے غیظ و غضب کے آثار نمایاں تھے ـــــ

بلسا ـــــ ستروہن ہلتیا کو بلسا بنا دینا چاہتے تھے! دیا کرو مجھ پر دیا ـــــ! . . . نہیں تو تمہارے کارن میری جان جائیگی ـــــ

بس ہو چکا ـــــ وہ کہنے لگی! ٹھاکر رہنے دو! اگر کسی نے سن لیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی ـــــ؟

مگر ـــــ وہ تو کسی نہ کسی دن سب سن ہی لیں گے! جب میں نہ ہوں گا تو گاؤں بھر سارا حال جان جائیگا ـــــ

ستروہن نے ۔ بدنان کی پوری دھمکی دیتے ہوئے جواب دیا ـــــ!
اتنے میں بکریا گڑوریں کھانسنے لگا ـــــ!

اری ہلتیا ـــــ چلم بھر دے ـــــ!

ستروہن جلدی سے اٹھکر اپنے گھر کی طرف چلدیا یہ کہتے ہوئے کہ کل آؤں گا ـــــ!

رو سے اور ڈھاک کی سوکھی ہوئی پتیاں، اور ٹہنیاں جھٹکتے ہوئے ہلتیا سوچ میں پڑ گئی ـــــ کہ بھگوان اب کیا ہوگا ـــــ؟ اگر ستروہن نے بدنام

ہی کر دیا تو پھر کیا ہوگا میں تو کہیں کی بھی نہ رہوں گی — بھگوان جانے لوگ کیا
سمجھیں — اور رشیو راما کیا خیال کریں — کہیں گے کہ اس نیشنگ پور کی تمام
لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں —!

گرم گرم آنچوں کے سامنے جمائیاں لیتے ہوئے اس نے ایک
بھرپور انگڑائی لے کر بکھرے اپنے خیالات کو سمیٹنے کی کوشش کی — کتنا پاپی ہے
ستر دمن میں تو اسے [illegible] بھی ہوں — ور — ... اور!

یکایک اس کی نگاہیں اپنی ہنسلی کے نیچے تک پہنچ گئیں۔
جہاں سے کالی کالی اوڑھنی سرک کر اس کے دونوں شانوں پر پہنچ چکی تھی۔
ایسا محسوس ہونے لگا ہے۔ جیسے دو گرم گرم تیز شعلے سلگتی ہوئی پتیوں
سے نکل کر اس کے سینے تک پہنچ گئے ہیں — تڑپنے کی ایک شرم نے اس
کی نگاہیں جھکا دیں —!

پانی میں سے بھاپ کی چھاگ اٹھ رہی تھی — چولہا کی آگ بڑی
طرح تیز ہو چکی تھی وہ مست و بیخود ان گزرے ہوئے واقعات کو سوچ رہی تھی
جو ابھی تھوڑی دیر ہوئے بیت چکے تھے!

نکرما — سامنے چلم کے دو بارہ گھونٹ کھانس کھونس کر پی چکا تھا —
وہ بیٹھی ہوئی فضائی میں خلا کے سینے تک پہنچ گیا تھا — یکایک ایک
دبی ہوئی آہٹ کچھ معلوم ہوئی — منیا نے دیکھا ستر دمن سامنے کھڑا تھا —
دھیرے دھیرے وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔
منیا کے پاس چپ چاپ بیٹھ کر بھٹی سے نکلتی ہوئی آنچوں سے

وہ اپنے ہاتھ سے ٹینک رہا تھا ۔

نہیں — مجھے اسی آگ میں ڈال دو — نہیں تو میں خود ہی کود نہ پڑوں گا — آج میرا تمہارا فیصلہ ہو کر ہی رہے گا —!

ستروہن آج سب کچھ کہہ ڈالنا چاہتا تھا —

بولو — بولو! کیا کہتی ہو — ایک ذرا سی بات ۔

وہ کانپنے لگی — اس کی نگاہوں میں غیظ و غضب کے بھڑکتے ہوئے شعلے بجھ گئے — اور — اور ستروہن اس سے قریب ہوتا چلا گیا — اتنا قریب کہ ان کے جسموں سے نکلتے ہوئے بہت ہی تیز شعلوں نے جھنبی کی آگ کو بالکل سرد کر دیا — ..... ! اتنا سرد کہ اور سلگتے ہوئے جگا — کولھو کے پاس سے پکار کر کہا —!

بتیا — آگ ٹھنڈا ہوا جاتا ہے — کیا سو گئی ہے؟

سوکھی ہوئی گھاس اور پتیوں سے ایک آہٹ کا طوفان امنڈ پڑا — وہ گھبرا کر اس سے الگ ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے ڈھاک اور روسے کے سوکھے ہوئے پتوں کو سمیٹنے لگی —!

بتیا کے بیاہ کی بات چیت پکی ہو چکی تھی اور بکریا نے ۔ چندن اور کی رسم بھی ادا کر کے گویا چندن پاسی کے لڑکے کو باقاعدہ داماد بنا لیا تھا — صرف بھنوری اور گونا باقی تھا —!

اس دن کے واقعہ کے بعد بتیا اور ستروہن اکثر چھپ چھپا کر ملتے

کوئی کہتا — کہ یہ تو صدا کی ایسی ہی تھی — کسی کا خیال تھا کہ اس کی ماں
اور تمام کنبہ ہی ایسا ہے — خود ہلتیا بیاہ کے تیسرے مہینے بعد پیدا
ہوئی —!

مختصر یہ کہ سارا نرسنگ پور دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا —
اس لئے نہیں کہ نرسنگ پور میں یہ کوئی پہلا واقعہ تھا بلکہ اس لئے کہ یہ ایک
غریب پاسی کی آبرو کا سوال تھا۔ ورنہ سبھی جانتے تھے۔ ٹھاکر ملکھان سنگھ
کے گھر میں کیا ہوا جو اس گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار ہیں —
اس قسم کے درجنوں واقعات آئے دن اس گاؤں میں ہوتے رہتے تھے مگر
آج ہلتیا کا باپ گناہ کی اس دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں پاپ پاپ ہے — دھایاپ
بن جاتا ہے۔ ہلتیا نے کئی بار گڑگڑا کر ٹھاکر سے مدد مانگی — مگر
ہمیشہ ٹھاکر نے بری طرح دھتکار دیا — جیسے اس پاپ سے انہیں دور
کا بھی واسطہ نہ تھا — مگر ماں کے کان بھی اب وہ سب چوس چکے تھے جو
ایک باپ کو نہ سننا چاہیئے تھا — مصیبتوں کا یہ قافلہ ایک ہنسیا اس
سمت کو چلا جا رہا تھا — چپ چاپ! بالکل خاموش — ایک
ایسی منزل کی طرف جہاں تباہیاں ہی تباہیاں تھیں —

اس گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر صرف ایک ہی کہانی — ایک
فسانہ ایک ہی قصہ تھا — پھر بھی [illegible] دور تک بات اگر پھیل جاتی تو گرد پیش
کے دیہاتوں میں اس کا چرچا ہوتا تو تب ہی تھا — چنانچہ
ہلتیا کا باپ خس پوش چھپروں پر چڑھا زور زور سے چیخ رہا تھا — چھا...

رہا تھا ۔۔۔ اور اس طرح شور مچا رہا تھا جیسے دنیا میں سب سے پہلا پاپ ہلسیا ہی نے کیا ہے ۔۔۔

بڑھا بکرم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ساری دنیا کی طرف دیکھ رہا تھا بے بسی اور لاچاری کے ساتھ ۔۔۔ بھگوان یہ کیا ہو گیا ۔۔۔ ایشور لگے جنم میں میں نے وہ کون سا پاپ کیا تھا جس کا بھگتان آج بھگتنا پڑ رہا ہے ۔ جسکی سزا آج دی جا رہی ہے مجھے ۔۔۔ اب میں کس منہ سے چندن کے دروازے پر ہلسیا کا پاپی ڈولا پہنچانے جاؤں گا ۔۔۔ بھائی ۔ برادری اور سارا سنسار کیا کہیگا مجھے ۔ دنیا کیا سمجھے گی ۔!

اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ بھگوان اب کیا ہو گا ۔۔۔ ؟ وہ کسمسا کر اپنی آنکھیں موند لیتا جو اس پاپی سنسار کی رنگین روشنی سے اکتا گئی تھیں ۔۔۔ یہ کلجگ ۔۔۔ اپنائے ۔۔۔ اندھیر ۔۔۔ پرماتما تو کہاں ہے ۔۔۔!

دھرتی ماتا تو نے اس جیون سنسار کو کیوں نگل نہ لیا اب تک ۔!

جیجا ۔۔۔ میری ناک بھی کٹوا دی تم نے ۔۔۔!

اس کے کان بجنے لگے ۔۔۔ رمیشور کہہ رہا تھا سامنے کھڑا ہوا ۔۔۔

بکرما سوچنے لگا گر رمیشور یہ کہیگا تو میں اسے کیا جواب دوں گا ۔ میری آنکھیں بھی اس سے چار نہ ہو سکینگی ۔۔۔

بکرما کا خیال غلط نہ تھا ۔۔۔ چندن اور رمیشور کو جب یہ خبر پہنچیں تو صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ ایسی پاپی لڑکی سے بیاہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں ۔۔۔ بیچارہ بکرما اس کا اب بھی کیا دیتا ۔۔۔ ہ اپنی مجبوری اور لاچاری پر دل

سارے گھر کی بربادی برداشت کی تھی ۔۔۔ ! جو سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا ۔۔ جس نے کبھی بھول کر بھی اس سے کچھ نہ پوچھا ۔۔۔! ۔۔۔ مگر اس کی اکھڑتی ہوئی سانسیں جیسے بلسیا کو زندگی کا پیام دے رہی تھیں ۔۔۔ ہمیشہ جینے والا پیغام ۔۔۔ سدا زندہ رہنے والا پیام ۔۔۔ کبھی نہ مرنے کا سندیس ۔۔۔ کیونکہ پاپ کبھی مرتا نہیں ۔۔۔ لوگ نیکیوں کو بھول جاتے ہیں ۔۔۔ مگر برائیوں کو نہیں ۔۔۔ ؟

بکرما کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھڑک رہا تھا ۔۔۔ بلسیا ٹکٹکی باندھے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی کہ مرنے والے کی آخری ہچکیوں نے شاید اسکی تمنا پوری کر دی ۔۔۔ بکرما مر چکا تھا ۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس نفرت خیز دنیا کو چھوڑ چکا تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور بلسیا کے سامنے زمین پر اس کے "ان سمجھے پاپ" کی پہلی نشانی پڑی ہوئی بلک بلک کر رو رہی تھی شاید اس لئے کہ وہ اس پاپ کی دنیا میں آنا نہیں چاہتی تھی ۔۔۔

ختم شُد